ISSN - 2582 - 3612

سہ ماہی
# ساغرِ ادب
مظفرپور

پیئر ریویوڈ اُردو جرنل

جلد : ۷ شمارہ : ۲۴
(جنوری تا مارچ ۲۰۲۵ء)

مدیرِ اعلیٰ (اعزازی)
پروفیسر سید آلِ ظفر

سہ ماہی ساغرِ ادب مظفرپور January to March 2025 Vol- 7. Issue - 24 مدیرِ اعلیٰ (اعزازی) پروفیسر (ڈاکٹر) سید آلِ ظفر

RNI No. BIH URD / 2019 / 78036
ISSN - 2582 - 3612

Vol - 7. Issue - 24
Jan. to March 2025

Quarterly
# SAGHAR E ADAB
Muzaffarpur

Peer - Reviewed Urdu Journal

Chief Editor (Honorary)
Dr. Syed Alay Zafar
Professor & Head
UNIVERSITY DEPTT. OF URDU
B. R. A. BIHAR UNIVERSITY
MUZAFFARPUR - 842 001 (BIHAR)
MOB. +91 94300 84261, +91 90062 53903

NO BRANCH Ph.: 2303206
سونے اور چاندی کے گارنٹی شدہ زیورات
خزانہ جوئیلرس
مرادپور، پٹنہ ۴
Khazana JEWELLERS
MURADPUR, PATNA - 4
پروپرائٹر: محمد صابر و محمد یٰسین

With best Compliments from
Namaz-e-Eidain Committee
Gandhi Maidan, Patna

ARIF MAHBOOB (Member)
MAHMOOD ALAM (President)

R.N.I. No. : BIH URD/2019/78036

ISSN : 2582 - 3612

Quarterly

# SAGHAR E ADAB Muzaffarpur

**(Peer - Reviewed Urdu Journal)**

جلد : ۷ شمارہ : ۲۴ جنوری تا مارچ ۲۰۲۵ء

مُدیرِاعلیٰ (اعزازی) : پروفیسر سیّد آلِ ظفر مُدیرہ : کہکشاں یاسمین

**زرِتعاون**

فی شمارہ : 350روپے، سالانہ 1,500روپے (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)، تاحیات 15,000روپے، دیگر ممالک 60ڈالر

معاون : امام الدین امامؔ +91 62061 43783

صفحات : ۱۸۴

سرِورق : سیّد آلِ محتشم، سیّد آلِ حاشر و فائزہ ظفر

**Bank Details**

SAGHAR E ADAB, Saving A/c No. 37510 50251

IFSC : CBIN 0284935

Central Bank of India, L.S. College Branch, Muzaffarpur (Bihar) India

**Google Pay/Phone Pay No.- 9006253903**

اس شمارے کے قلم کاروں کی آراء سے ’’ساغرِ ادب‘‘ کے مُدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

کسی بھی قابلِ اعتراض تحریر یا دیگر متنازعہ معاملات کی قانونی چارہ جوئی صرف مظفرپور عدالت ہی میں ہوگی۔

**خط و کتابت و ملنے کا پتہ**

*Chief editor*

SAGHAR E ADAB

Husaina House, Zakaria Colony, Mohalla - Sadpura

P.O. - Ramna, Muzaffarpur - 842 002 (Bihar) India

Mob. +91 94300 84261, +91 90062 53903

سہ ماہی

# ساغرِ ادب مظفرپور

(پیئر ریویوڈ اُردو جرنل)

جلد : ۷ شمارہ : ۲۴

جنوری تا مارچ ۲۰۲۵ء

مُدیرِاعلیٰ (اعزازی)

ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

پروفیسر و صدر

پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اُردو

بی۔آر۔اے۔بہار یونیورسیٹی، مظفرپور

بہار (انڈیا)

CamScanner

## LIST OF EDITORIAL BOARD

1. **Prof. Alimullah Hali**
   Ex. Head
   University Deptt. of Urdu
   Magadh University, Bodh Gaya
2. **Prof. Farooque Ahmad Siddiqui**
   Ex. Head
   University Deptt. of Urdu
   B.R.A.Bihar University, Muzaffarpur
3. **Prof. Rais Anwer**
   Ex. Head
   University Deptt. of Urdu
   L. N. Mithila University
   Darbhanga
4. **Prof. Hameed Suharwardy**
   Ex. Chairman
   Deptt. of Urdu & Persian
   Gulbarga University
   Gulbarga (Karnataka)
5. **Prof. K. Habeeb Ahmed**
   Ex. Head
   Deptt. of Arabic, Persian & Urdu
   University of Madras
   Marina Campus, Chennai
6. **Prof. Anwar Pasha**
   Former Chairperson
   Centre of Indian Languages
   SLL & CS
   JNU, New Delhi
7. **Prof. Qamrul Hoda Faridi**
   Prof. & Chairman
   Deptt. of Urdu
   Aligarh Muslim University
   Aligarh (U.P.)
8. **Dr. Amir Mustafa Siddiqui**
   Ex. Head
   University Deptt. of Urdu
   Vinoba Bhave University
   Hazaribagh
9. **Prof. Manzer Hussain**
   Ex. Head
   University Deptt. of Urdu
   Ranchi University
   Ranchi
10. **Prof. (Mrs.) Nusrat Fatema**
    Head
    Deptt. of Urdu
    Government Arts College
    Kota (Rajasthan)

**ویب سائٹ**

**www.saghareadab.in**

**ای میل**

**saghareadab@gmail.com**

**syedalayzafar@gmail.com**

اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدّت خریداری ختم ہو چکی ہے۔
اگر اگلے سال کا زرِ سالانہ آپ سے موصول نہیں ہوا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ آگے خریدار بنے رہنا نہیں چاہتے ہیں۔
(مدیرِ اعلیٰ)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر و پروپرائٹرس **کہکشاں یاسمین** نے انڈین آرٹس آفسیٹ، بیسمنٹ آف اسٹیٹ بینک آف انڈیا، مہندرو، پٹنہ میں چھپوا کر دفتر ''ساغرِ ادب''، حُسینا ہاؤس، زکریا کالونی، محلّہ۔ سعد پورہ پوسٹ۔ رَمنہ، مظفر پور۔ 842 002 (بہار)، انڈیا سے شائع کیا۔

**مُدیرِ اعلیٰ** (اعزازی) : **پروفیسر سیّد آلِ ظفر**



CamScanner



# فہرست

| نمبر شمار | رشحاتِ قلم | اربابِ قلم | صفحہ نمبر |
|---|---|---|---|
| ۱ | اداریہ | پروفیسر سیّد آلِ ظفر | ۶ |
| ۲ | حمدِ باری تعالیٰ | شاذ رمزی | ۹ |
| ۳ | نعت پاک | ظفر انصاری ظفر | ۱۰ |
| ۴ | حقیقت نگار سخنور: مقبول منظؔر | پروفیسر سید حسن عباس | ۱۱ |
| ۵ | معاشرتی کجرویوں کا علمبردار: سعادت حسن منٹو | پروفیسر ساجد علی قادری | ۱۹ |
| ۶ | اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر | ڈاکٹر صبیحہ سمیر الدین سید | ۲۴ |
| ۷ | قومی یکجہتی کا علمبردار: نظیر اکبر آبادی | ڈاکٹر پنکج کانت راجن | ۲۸ |
| ۸ | رسؔا جاودانی کی اُردو شاعری: ایک مطالعہ | ڈاکٹر ظہور احمد مخدومی | ۳۲ |
| ۹ | ایک مشہور لیکن گمنام افسانہ نگار: احمد علی | ڈاکٹر صفیہ فاطمی | ۳۸ |
| ۱۰ | اسلوب احمد انصاری کی تنقید نگاری | ڈاکٹر عبدالواحد | ۴۴ |
| ۱۱ | مولانا ابوالکلام آزاد: معمارِ ادب و صحافت و سیاست | ڈاکٹر رفعت عالیہ | ۵۱ |
| ۱۲ | اردو زبان کی پیدائش سے متعلق ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی کا نظریہ | ڈاکٹر افسانہ پروین | ۵۶ |
| ۱۳ | مکاتیبِ غالب کا سماجیاتی مطالعہ | ڈاکٹر قمر نازنین | ۶۱ |
| ۱۴ | حافظ شیرازی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا تقابلی مطالعہ | ڈاکٹر شوکت علی | ۶۸ |
| ۱۵ | اکرام باگ کی افسانہ نگاری | ڈاکٹر روزی ناز | ۷۴ |
| ۱۶ | شوکت حیات کی افسانہ نگاری: ''گنبد کے کبوتر''...... | ڈاکٹر محمد ولی اللہ | ۷۷ |
| ۱۷ | مشتاق احمد یوسفی کی تصانیف کا مختصر تعارفی تجزیاتی مطالعہ | انظار الحق انصاری | ۸۲ |
| ۱۸ | ڈاکٹر کلیم عاجؔز اور ان کی مکتوب نگاری | حنا تبسم | ۸۸ |
| ۱۹ | منظور وقار : بحیثیت طنز و مزاح نگار | محمد مردان | ۹۲ |
| ۲۰ | میر تقی میر کی عظمت کا راز | محمد معروف عالم | ۹۶ |
| ۲۱ | نور الحسنین کے ناول ایوانوں کے خوابیدہ چراغ کا تنقیدی جائزہ | محمد مزمل فاروقی | ۱۰۳ |
| ۲۲ | غیاث احمد گدی کے افسانے | محمد نبی حسین | ۱۱۲ |

ISSN : 2582 - 3612

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۲۳ | پروفیسر علامہ نادم بلخی کی شخصیت ناقدین کی نظر میں | نادرہ افروز | ۱۱۹ |
| ۲۴ | حسین الحق بحیثیت افسانہ نگار | نیاز احمد | ۱۲۵ |
| ۲۵ | مولانا اعجاز احمد اعظمی کی خطوط نگاری کے نمایاں پہلو | صادق حسین | ۱۲۹ |
| ۲۶ | ادب میں سماجی مسائل کی عکاسی | نورالہدیٰ | ۱۳۴ |
| ۲۷ | اردو کی ارتقا میں سولہویں صدی کے صوفیا کا کردار | محمد کلیم الدین | ۱۴۱ |
| ۲۸ | اردو نظم میں ''ادب برائے زندگی'' کا تصوّر | محمد رضوان | ۱۴۶ |
| ۲۹ | بہار کی خانقاہیں اور مشہور خانقاہوں کی خدمات | سیّد وسیم اللہ بخاری | ۱۵۱ |
| ۳۰ | ایک سلطانہ اور ادیبہ کی خودنوشت: گوہر اقبال | نکہت انجم ناظم الدین | ۱۵۶ |
| ۳۱ | شاد عظیم آبادی کی غزل گوئی | شاذیہ خاتون | ۱۶۰ |
| ۳۲ | رام لعل کی ناول نگاری کا تنقیدی تجزیہ | شمع روبی | ۱۶۵ |
| ۳۳ | ظفر امام کی نظم نگاری: ایک جائزہ | عیسیٰ اسلم | ۱۷۲ |
| ۳۴ | ''سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ'' بحیثیت تاریخی سوانح عمری، ایک جائزہ | نوراللہ نیاز مدنی | ۱۸۰ |


R.N.I. : BIH URD/2019/78036

CamScanner



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اداریہ

''ساغرِ ادب'' کے قارئین کرام اس امر کی شہادت دیں گے کہ ادبی شخصیتوں کے انتقال پر ہم نے ہمیشہ اپنے اداریے میں ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور دعائے مغفرت بھی کی ہے۔ اپنے مرحومین کے لیے اس سے زیادہ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ہمارے اس نقطہ نظر کی آپ حضرات نے ہمیشہ تائید و تحسین فرمائی ہے۔ چنانچہ یہ نورانی اور روحانی سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پیش نظر شمارہ (جنوری تا مارچ ۲۰۲۵ء) میں اردو کی بہت ہی معروف و مقبول ادیبہ پروفیسر قمر جہاں مرحومہ کو خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہتے ہیں۔

پروفیسر قمر جہاں ۱۵ر مئی ۱۹۴۸ء کو موضع بزرگ دوار، ضلع سمستی پور (بہار) میں پیدا ہوئیں اور ۱۱ر فروری ۲۰۲۵ء کو راہیِ ملک عدم ہوگئیں۔ ان کی رحلت ان کی اپنی رہائش گاہ محلّہ بھیکن پور، شہر بھاگلپور (بہار) میں ہوئی اور تدفین بھی اسی محلے کے قبرستان میں ہوئی۔ رب کریم ان کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عنایت کرے۔ مرحومہ کے والد مرحوم کا نام سیّد عطاء الحق تھا جو اپنی بستی کے معززین میں شمار ہوتے تھے۔ مرحومہ کے شوہر مرحوم سید بدر الحسن بھی بڑے شریف النفس اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ مرحومہ اردو کے مشہور شاعر و نقاد پروفیسر علیم اللہ حالی کی سگی بھانجی تھیں۔ ان کے ذوق ادب کی پرورش بچپن ہی سے علمی و ادبی ماحول میں ہوئی۔ ان کا تعلیمی سفر پٹنہ میں رہ کر شروع ہوا۔ ہائی اسکول کی تعلیم بھی وہیں سے حاصل کی۔ بی۔ اے کا امتحان مگدھ مہیلا کالج، پٹنہ سے پاس کیا اور پھر ایم۔ اے (اُردو) پٹنہ یونیورسٹی سے کیا اور پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ رانچی یونیورسٹی سے پروفیسر وہاب اشرفی کی نگرانی میں مکمل کیا۔ ان کا موضوعِ تحقیق تھا ''اختر شیرانی کی جنسی و رومانی شاعری''۔

اصناف ادب میں ان کو افسانہ نگاری اور تنقید نگاری دونوں سے فطری لگاؤ تھا۔ ان کا پہلا افسانہ ''جنون وفا'' ماہنامہ ''صبح نو'' پٹنہ، شمارہ فروری ۱۹۶۴ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس کے بعد وہ مسلسل چھپتی رہیں جس کے نتیجے میں ان کے کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے۔ جیسے چارہ گر (۱۹۷۳ء)، اجنبی چہرے (۱۹۹۱ء)، پنجڑے کا قیدی (۲۰۱۵ء)، یادنگر (۲۰۱۹ء) وغیرہ۔

افسانہ نگاری کے علاوہ ان کو تنقید نگاری سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ چنانچہ ان کے تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی ہمیشہ منظرِ عام پر آتے رہے اور وہ اردو کے اہم سیمیناروں میں بھی شرکت کرتی رہیں۔ ان کی تحقیقی کتاب ''اختر شیرانی کی جنسی و رومانی شاعری'' (۱۹۸۷ء) کو بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے

ISSN : 2582 - 3612

علاوہ ان کی تنقیدی و تحقیقی کتاب ''معیار (۱۹۸۸ء)، تانیثی تنقید ممتاز شیریں سے عہد حاضر تک (۲۰۱۴ء)، حرفِ آگہی (۲۰۱۶ء) اور ''فکر و نظر'' (۲۰۱۹ء)، ''پروفیسر علیم اللہ حالیؔ۔ نقوش و افکار''، کلام عبداللہ حافظ مشکی پوری (۲۰۰۸ء)، شکیلہ اختر'' (مونوگراف ۲۰۲۵ء) کی علمی و ادبی حلقوں میں زبردست پذیرائی ہوئی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے بحیثیت ایک افسانہ نگار اور اہم تنقید نگار اپنے آپ کو ہمیشہ صاحبان نقد و نظر کے لیے مرکز توجہ بنایا اور سرگرم ادبی زندگی گزاری۔ عصرِ حاضر کی خواتین ادیبوں اور افسانہ نگاروں میں ان کا نام بہت ہی ممتاز رہا اور آخر دم تک وہ ادب سے وابستہ رہیں۔ اس طرح ان کی موت کو ہم اردو ادب کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان کہہ سکتے ہیں۔

ان کا تعلق ایک انتہائی شریف اور باعزت گھرانے سے تھا اس لیے ان کے مزاج و طبیعت میں بڑی شرافت اور نفاست تھی۔ اسلامی اور اخلاقی اقدار کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھیں۔ تانیثیت کی تحریک کے نتیجے میں مغربی تہذیب سے جو آزادہ روی، عریانی و فحاشی دَر آئی ہے، اس کی وہ سخت مخالف تھیں۔ چنانچہ اپنے ایک افسانہ 'چانداور چکور'' میں لکھتی ہیں:

''عورت بھی اپنے دائرے میں ہی اچھی لگتی ہے۔''

یہ ان کا بڑا قیمتی جملہ ہے اور آج کی فیشن پرست لڑکیوں اور عورتوں کے لیے عبرت انگیز بھی، اسی لیے میں نے کہا ہے کہ مرحومہ اسلامی اقدار و تعلیمات کی زبردست علم بردار تھیں۔ اس جہت سے بھی ان کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

بحیثیت لکچرار ان کی تدریسی زندگی کا آغاز سندر وتی مہیلا کالج، بھاگلپور سے ہوا۔ اور پھر وہ ترقی کر کے تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسٹی، بھاگلپور کے شعبہ اردو میں بحیثیت استاد مقرر ہوئیں اور پھر ترقی کر کے منصبِ صدارت تک پہنچیں۔ بحیثیت صدر شعبۂ اردو، بھاگلپور یونیورسٹی میں سینیٹ کی ممبر بھی رہیں اور راج بھاشا، پٹنہ اردو کی مشاورتی کمیٹی کی رکنیت بھی ان کو ملی۔ اس طرح اردو اداروں اور انجمنوں نے بھی ان کو نوازنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ چنانچہ پروفیسر قمر جہاں کو ان کی اعلیٰ ادبی خدمات کے نتیجے میں کئی اعزازات بھی ملے۔ جیسے لکھنؤ کی میرا اکادمی نے ان کو ۱۹۹۷ء میں ''اعزاز میر'' کا ایوارڈ عطا کیا۔ ۲۰۱۳ء میں بہار اردو اکادمی، پٹنہ نے ''قاضی عبدالودود'' ایوارڈ پیش کیا اور پھر ۲۰۱۵ء میں سہیل عظیم آبادی ایوارڈ بھی ملا۔

مختصر یہ کہ مرحومہ نے اپنی گوناگوں ادبی خدمات کی بدولت اردو کے ہم عصر ادب میں اپنی اہم شناخت بنائی اور اردو کی افسانہ نگار خواتین میں بہت ہی ممتاز و باوقار تھیں، ربِ کریم ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔



CS CamScanner



**نوٹ** : اشہر حسن و شہیر حسن مرحومہ کے دو پوتے ہیں جنھوں نے مل کر ایک ویب سائٹ بنایا ہے جس کا نام https://quamar-jahan.vercel.app/ ہے۔ مزید معلومات اس لنک سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

**آہ! پروفیسر راشد طراز مرحوم** : اردو کے ممتاز شاعر پروفیسر راشد طراز کے انتقال پُر ملال پر بھی ادارہ اظہارِ رنج و غم کرتا ہے۔ انہوں نے تقریباً نصف صدی تک اردو شعر و ادب کی خدمت کی ہے اور ادبی حلقوں میں اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی ہے۔ مونگیر یونیورسٹی، مونگیر کے بانی صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے انہوں نے اُردو زبان و ادب کی تعمیر و ترقی میں خصوصی دلچسپی لی اور اُردو خواں طلبہ و طالبات میں ذوقِ ادب بھی پروان چڑھایا۔ اس طرح ان کا شعبہ طلبہ و طالبات کے لئے مرکزِ توجہ بن گیا۔ افسوس ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ بہت جلد ہم لوگوں کے درمیان سے رخصت ہو گئے۔ ۴؍ مارچ ۲۰۲۵ء اُن کی رحلت کی تاریخ ہے۔

ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف بڑے بڑے ادیبوں نے کیا ہے۔ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی ان کے فن کی داد دی ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں ''کاسۂ شب، غبار آشنا، جہاں تک روشنی ہوگی، صبح ازل، گردش ناتمام، ستارہ شکست، شہر منافق'' اور ''سرگراں'' بہت مشہور ہوئے۔ انہوں نے اپنی سوانح عمری بھی لکھی تھی۔ اس کا نام ہے۔ ''فاصلہ مختصر ہوئے''۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے شعری و ادبی کارنامے اردو ادب میں گراں بہا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادارہ دعا گو ہے کہ ربّ کریم ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

**۱۰؍ مارچ ۲۰۲۵ء** **پروفیسر سیّد آلِ ظفر**

شاذ رمزی

# حمدِ باری تعالیٰ

میرا وجود تجھ سے ہے تونے ہی دی جلا
خالق ہے تو کریم ہے تو ہی مرا خدا

حاکم ہے تو غلام ترا میں نفس نفس
تعریف تیری کرتا ہوں تیری ہی ہے عطا

تیری چمک ہے چاند میں سورج میں تو ہی تو
تو ہے بہار و باغ میں پھولوں میں تو بسا

بادل میں تو ہے بارشوں میں تو ہی نغمہ زن
سورج میں تو ہے دھوپ میں تیری ہی ہے ضیاء

حمد و ثنا چرند بھی کرتے ہیں رات دن
بادِ صبا میں اُڑتے پرندے کریں دعا

تسبیح تیرے نام کی کیڑے بھی پڑھ رہے
تو ہی سمندروں میں کھلاتا انہیں غذا

پتھر کے درمیان بھی مخلوق ہے تیری
ہیں انیس یہ پہاڑ بھی دیتے تجھے صدا

جن و بشر بھی ہیں ترے ، تیرے شجر حجر
انساں کو تونے سب سے ہی افضل بنا دیا

تیرا دیا ہی کھایا مہد سے لحد تلک
اوقات کس کی ہے جو کھلائے ترے سوا

کوثر ترا ہے تیری ہی جنت کمال ہے
محشر کرے گا تو ہی یہاں ایک دن بپا

رحمت تری بڑی ہے گناہوں کے سامنے
راضی رہے تو مجھ سے یہی شاذؔ کی دعا





ظفر انصاری ظفرؔ

# نعت پاک

رہوں تا زندگی میں کیوں نہ اُن کا مدح خواں ہوکر
زمانے میں جو آئے راحتِ قلبِ تپاں ہوکر

جدھر سے ہوکے گزرے سرورِ دیں ، رحمتِ عالم
وہ صحرا ہو گیا دم بھر میں رشکِ گلستاں ہوکر

سرِ میدانِ محشر جلوہ فرماآپ جب ہوں گے
کھِل اُٹھے گا ہر اک عاصی کا چہرہ شادماں ہوکر

اطاعت جو کرے گا دل سے سرخیلِ رسولاں کا
رہے گا دونوں عالم میں وہ بے شک کامراں ہوکر

کوئی پہنچا دے مجھ کو روضۂ شاہِ مدینہ تک
''پھروں کب تک پریشاں بُلبل بے آشیاں ہوکر''

مساوات اُن کی دیکھو، ہیں وہ بیٹھے عام لوگوں میں
حبیبِ خالقِ کل ، سرورِ ہر دو جہاں ہو کر

شہِ کونین کی نعلین سے جھڑتے ہیں جو ذرّے
شبِ اسریٰ چمکتے ہیں وہ تاجِ کہکشاں ہوکر

تسلی دیتی رہتی ہیں شبِ غم آپ کی یادیں
کبھی تسکینِ دل بن کر ، کبھی آرامِ جاں ہوکر

سنایا آپ نے تا زندگی پیغامِ ربّانی
رہے دنیا میں آقا رب کل کا ترجماں ہوکر

عنایت کی نظر ہو اے شہِ دیں میری جانب بھی
کہیں میں رہ نہ جاؤں قیدئ دردِ نہاں ہوکر

جو مل جائے مجھے اِذنِ زیارت ان کی جانب سے
پہنچ جاؤں درِ اقدس پہ گردِ کارواں ہوکر

پہنچتا ہے جو رستہ اے ظفرؔ گل زارِ جنت کو
گزرتا ہے وہ شاہِ دوسرا کا آستاں ہوکر

ISSN : 2582 - 3612

پروفیسر سید حسن عباس

# حقیقت نگار سخنور: مقبول منظرؔ

نومبر 1996ء میں مَیں نے جی ایل اے کالج ڈالٹن گنج میں بہ حیثیت اردو لکچرر جوائن کیا تو پروفیسر نادم بلخی (1928-2006ء) جیسی نابغۂ روزگار شخصیت کی خدمت میں پہلی بار حاضری دی۔ موصوف اسی کالج سے سبکدوش ہوئے تھے۔ یہیں مجھے آج کے حقیقت نگار سخنور مقبول منظر صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ میں تقریباً سات سال تک وہاں مقیم رہا اور شاید ہی ایسا کوئی دن گذرتا ہو جب ان سے ملاقات نہ ہوتی ہو۔ اس سات سال کے دوران میں نے انہیں ہر رنگ میں دیکھا جس کا ذکر ڈاکٹر خورشید عالم صاحب نے ''روشن دریچے'' (از مقبول منظر) کے مقدمے میں تفصیل سے کیا ہے۔ وہ نادم بلخی صاحب کی خدمت میں اصلاح کی غرض سے حاضر ہوتے تھے اور پھر گھنٹوں مختلف موضوعات پر گفت و شنید ہوتی تھی۔ لیکن ایک بات تسلیم کرنی ہوگی کہ وہ کڑے سے کڑا وقت دیکھنے اور بُرے سے بُرے دَور سے گذرنے کے باوجود اپنے شوقِ شعر گوئی سے کبھی دستبردار نہیں ہوئے۔ نتیجے میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت وہ ''انوارِ معرفت، چھاؤں مرے حصے کی، اور روشن دریچے'' تین شعری مجموعوں کے مالک تو ہیں ہی، اپنے استادِ نامدار کا نام بھی روشن کر رہے ہیں۔ شہود ثمرؔ نے اپنی ایک طویل نظم میں جو نادم بلخی صاحب کی شان میں ہے، مقبول منظرؔ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ہیں مقبول منظرؔ جو یوں نغمہ بار    وہ شاگرد نادمؔ کے ہیں ہونہار

جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ انہوں نے کیسا کیسا دَور دیکھا ہے اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنا راستہ بدل دیتا۔ کم سے کم شاعری سے تو توبہ ضرور کر لیتا کیوں کہ اس سے دھرم کرم تو نہیں چل سکتا تھا، وہ خود کہتے ہیں۔

اپنوں نے آنکھ پھیر لی منظرؔ تو کیا گلہ    اِس شہر میں تو اپنی ہَوا بھی پلٹ گئی
اپنا سب کچھ لُٹا کے دیکھ لِیا    جو نہ پانا تھا پا کے دیکھ لِیا

آپ بیتی قسم کے اشعار ان کی غزلوں کے دونوں مجموعوں میں کثرت سے ملیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاعر پر جو کچھ گذری، اُسے مِن وعَن اشعار کے قالب میں پیش کر دیا ہے جس سے اُن کی

R.N.I. : BIH URD/2019/78036

CamScanner



شاعری میں ایک خاص طرح کی گداختگی پیدا ہوگئی ہے اور یہ صفت ان کے کلام سے مخصوص ہوگئی ہے۔ وہی شاعری باقی رہتی ہے جس کے لئے کہا گیا ہے کہ 'از دل خیزد بر دل ریزد' جس میں قاری کو اپنے کرب و اضطراب، اپنے احساسات و جذبات، اپنے حالات اور اپنے روز مرّہ کے معمولات و مسائل کا عکس نظر آیا ہے تو وہ کیوں کر متاثر نہ ہوگا۔ شرط ہے شاعر کے خیالات و جذبات کو اسی نہج سے سمجھنے اور پرکھنے کی، جو خود انسان محسوس کرتا ہے۔ حقیقت نگار شاعر وہی سمجھا جاتا ہے جس نے معاشرے کے معاملات و مسائل کو کُھلی آنکھوں سے دیکھا اور ان میں اپنے احساسات کی آنچ سے گرمی پیدا کر کے، الفاظ میں پرو کے اشعار کے قالب میں پیش کر دیا۔ جو بات قاری کو متاثر کرے گی وہ ایک تو وہ موضوع ہے جس پر شاعر نے اظہار خیال کیا ہے اور دوسرا اُس کا طرزِ اظہار، جسے ہم اسلوب بیان بھی کہتے ہیں۔ مقبول منظر نے اِن دونوں باتوں پر خاص توجہ دی ہے۔ ان کی شاعری پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی یہ احساس جاگزیں ہونے لگتا ہے کہ انہوں نے موضوعات تو اپنے معاشرے سے اخذ کئے ہیں اور انہیں شاعری کا جامہ پہناتے وقت اسلوب واَدا پر خاص توجہ دی ہے جس سے ان کے بیان کی صداقت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کو صرف عشق و محبت کے تذکرے تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ زبان کے چٹخارے کے لئے جا بہ جا عشق و محبت اور حُسن کی دلفریب اَداؤں کو بھی مورِدِ التفات قرار دیا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے ان کی غزلوں میں 'حرفِ بازنان گفتن' کم تر اور 'ہوتی ہے یہاں دل کی ہر ایک بات غزل میں/ زیادہ تر مشاہدہ ہوتا ہے اور ایک حقیقت نگار شاعر و ادیب سے یہی توقع بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنی تخلیقات میں لفاظی سے ہَٹ کر سچائی اور راست گفتاری سے کام لے اور مقبول منظرؔ کے یہاں یہ سچائی اور راست گفتاری آپ کو ہر جگہ نظر آئے گی جسے بہ الفاظ دیگر حقیقت نگاری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

مقبول منظرؔ کی پرورش و پرداخت اور نشو و نما جس ماحول میں ہوئی ہے اُسے ہم اقتصادی طور پر نا آسودہ ہی کہیں گے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے عزم و جزم سے تعلیم کو آگے بڑھایا اور آج وہ ایک کالج میں استاد کی حیثیت سے تعلیم و تعلم سے اپنا رشتہ برقرار رکھے ہوئے ہیں لیکن اِس نا آسودگی نے اُن کا پیچھا اَب بھی نہیں چھوڑا ہے پھر بھی یہ ان کے مزاج اور طبع کی استقامت ہی ہے جس کے باعث وہ پرورشِ لوح و قلم کرتے جا رہے ہیں۔

ڈالٹن گنج کی ادبی و شعری فضا سے متاثر ہو کر شعر و سخن کی وادی میں قدم رکھنے کے بعد انہوں نے علامہ نادمؔ بلخی کے درِ دولت پر حاضری دی اور گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر کے مصداق شاعری کی باریکیوں کی افہام و تفہیم کا سلسلہ شروع کیا۔ علامہ نے جس محنت و شفقت سے نکات سخن سمجھائے اور مقبول منظر کے ناتراشیدہ افکار و خیالات کے حامل اشعار کو نہایت سلیقے سے شاعری کے اصول و ضوابط کے تحت اشعار کے

ISSN : 2582 - 3612

قالب میں ڈھالنے کے گُر سکھائے اور دیکھتے دیکھتے مقبول منظؔر اپنے ہم عصر شاعروں کے درمیان انفرادیت حاصل کرتے گئے۔ جب میں نے کتاب ''ذکر نادم بلخی'' (مطبوعہ 2005ء) شائع کی تو اس میں مقبول منظؔر کی سانیٹ کی ہیئت میں نادم بلخی پر ایک نظم شامل کی۔ یہ نظم پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے جس سے مقبول منظؔر کے اپنے استاد نادم بلخی کے سلسلے میں کیا احساسات و جذبات ہیں، سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جس سادگی اور صفائی سے انہوں نے اپنے استاد کے اوصاف بیان کئے ہیں وہ کاملاً حقیقت بیانی پر مبنی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

نادم بلخی جن کا نام　　علم کی دولت اُن کے پاس
عزت، شہرت اُن کے پاس　　درس و تدریس اُن کا کام
علم و ہنر کے وہ راجہ　　لاکھوں اُن کے شہ پارے
فن کاری میں ہیں آگے　　علم و ادب کے ہیں خواجہ
پیاری پیاری جن کی بات　　علم و فن کے ہیں استاد
مل کر اُن سے دل ہو شاد　　اُن کی ایسی عالی ذات
میرے پاس جو منظؔر ہے　　اُن کے علم کا مظہر ہے

(ذکر نادم بلخی، ص۔۴۰۰)

مقبول منظؔر کی شاعری گوناگوں اوصاف کی حامل ہے۔ انہوں نے آدمیت اور انسانیت سے متعلق ڈھیر سارے موضوعات اپنی غزلوں میں پیش کئے ہیں۔ اُن کے یہاں ایک طرف فرقہ وارانہ ہم آہنگی، قومی یکجہتی، وطن پرستی اور دیش بھکتی یا بہ الفاظ دیگر حُب الوطنی، محروموں اور مظلوموں کے ساتھ ہمدردی، محبت و اخوت، حق اور باطل کی ستیزہ کاری، ظلم کے خلاف صدائے احتجاج، دوست دشمن کی پہچان، معیارِ نقد و شاعری کا منصفانہ محاکمہ، معرکۂ کربلا اور اس کے دور رَس نتائج نیز عالم انسانیت کی بیداری، نام نہاد شرافت اور حسن اخلاق اور طرح طرح کے معاملات و مسائل پر بڑی بے باکی اور صاف گوئی سے مگر غور و فکر کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے تو دوسری طرف خود کو بھی عطائے الٰہی پر صابر و شاکر اور قانع بتایا ہے اور یہ ساری باتیں سمجھنے کے لئے صرف ایک شرط ہے کہ 'پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی' دوسری طرف وہ خداوند عالم کی قدرتِ کاملہ پر بھرپور اعتقاد رکھتے ہوئے شکرانے میں اپنے گھر کو اُس کے گھر سے تعبیر کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ خدا ہر جگہ موجود ہے اور جو کچھ اُس نے عطا کیا ہے اس کا بہر طور شکر اَدا کیا جائے اور جو کچھ میسر ہے اس پر قناعت کی جائے اور صبر و تحمل سے کام لیا جائے ؎

میں ہوں بندہ، مرا خدا تُو ہے　　میری ہستی کا مدعا تُو ہے
تُو ہی منزل ہے، راستا تُو ہے　　رہ نوردی میں حوصلا تُو ہے


CamScanner



میرا ظاہر بھی عکس ہے تیرا　　میرے باطن میں بھی بَسا تُو ہے
بالیقیں وہ لگے گا ساحل سے　　جس کی نیّا کا ناخدا تُو ہے
حمد تیری ہے مژدۂ رحمت　　سر بہ سر بخشش و عطا تُو ہے
ہے توکل تجھی پہ منظؔر کو　　بے سہاروں کا آسرا تُو ہے
تُو نے بخشا ہے جو منظؔر کو برائے راحت　　گوشۂ شہر کا مشہور وہ گھر تیرا ہے

اُنہیں حالات حاضرہ کا بھی بہت اچھا ادراک ہے۔ بہ الفاظ دیگر کہا جا سکتا ہے کہ حالات حاضرہ پر اُن کی بہت پینی نظر رہتی ہے۔ انہیں اپنے معاشرے کی اچھائی اور برائی دونوں سے غرض ہے یعنی وہ چاہتے ہیں کہ معاشرہ برائیوں سے پاک ہو، اور ہر طرح کی کج روی، تلخی، فرقہ واریت، بے ہودہ رسم و رواج، آپسی نااتفاقیاں، مہنگائی، بے روزگاری، بے راہ روی، استحصال، ظلم و ستم، عدم مساوات، لوگوں کا دوُرخا پن، اخلاقی پستی، تن آسانی، ہمدردی، محبت و مروت کا فقدان، مظلوموں اور محروموں کی عدم حمایت، سیاست کے نام پر علاحدگی پسندی اور نفرت و دہشت گردی کی کاشت کاری یعنی ع

'ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ'

جیسے جراثیم نے ہمارے معاشرے کو تنزلی اور تباہی و بربادی کی طرف ڈھکیل دیا ہے اور ایک حقیقت نگار شاعر ہونے کے باعث مقبول منظؔر نے اپنے کلام میں اِن سب عناصر کو برملا کرنے کی جسارت کی ہے۔ ایسے حالات و واقعات دیکھ کر وہ آزردہ اور رنجیدہ ہوتے ہیں۔ ایسی کجرویوں پر کاری ضرب بھی لگاتے ہیں۔ یہ ایک سچے اور اچھے ادیب و شاعر کی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے بہ نحو احسن عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے۔ وہی تڑپ اور گھٹن محسوس کرے جس سے ہمارا معاشرہ رو بہ رو اور برسرِ پیکار ہے۔ مقبول منظؔر نے اپنی شاعری کے ذریعے اِن سارے مسائل کو خوش اسلوبی سے اٹھایا اور نہایت سادگی، صفائی اور بیباکی سے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

پیشِ نظر ہے صرف گماں اور کچھ نہیں　　باغِ حیات میں ہے خزاں اور کچھ نہیں
ذہنوں میں بھر رہے ہیں جو فرقہ پرست لوگ　　نفرت کا ہی دھواں ہے میاں اور کچھ نہیں
جس کے کمال فن کی مچی ہر طرف ہے دھوم　　ہے ناٹکی سا طرز بیاں اور کچھ نہیں
منظؔر جو سرد آہ سی دل سے نکل گئی　　شاعر کا ہے وہ درد نہاں اور کچھ نہیں
پرواز کی قوت اُسے ہرگز نہ ملے گی　　ہوگا جو تن آسانی میں مشہور پرندہ
عنقا ہیں میرے عہد میں ہمدردی و ایثار　　اخلاق کا ہر شخص میں گوہر نہ ملے گا
ہر سمت احتجاج کے نعرے بلند ہیں　　شاہین باغ جیسے ہیں حالات ان دنوں

کم ظرف اس قماش کے دنیا میں کم نہیں
ملی ہے منزلِ مقصود اُسی کو اے منظرؔ
اُن سے رشتہ ہے جانے کیا میرا
کاش کوئی ہو با وفا منظرؔ
بھاری پڑے گا اہلِ سیاست کو اَب جواب
نہیں ماحول کی گراس میں عکاسی تو اے منظرؔ
مقبول زمانے میں ہوا ہے وہی منظرؔ
مفلسوں کا جو سدا کرتا رہا مفت علاج
دوست جو ہوتا ہے منظرؔ واقعی
رہیۓ محتاط منظرؔ رفیقوں سے بھی
قدم ملا کے زمانے سے تم چلو منظرؔ

احسان بھول جاتے ہیں وہ محسنین کے
جو زندگی میں ہر اک امتحاں سے گذرے ہیں
جو ہیں ملنے کو بے قرار بہت
ہیں تو کہنے کو تیرے یار بہت
کرنے لگے ہیں لوگ سوالات اِن دنوں
بھلا کس منہ سے اپنی شاعری کی بات کرتے ہو
جو مرتکبِ پستیِ کردار نہیں تھا
وہ معالج نہیں، انساں میں فرشتہ ہوگا
ساتھ دشمن کا کبھی دیتا نہیں
دشمنوں سے اگر با خبر آپ ہیں
سبھی سے جادۂ منزل مگر جدا رکھنا

اِس طرح کے بہت سے اشعار اِن کے یہاں پائے جاتے ہیں جن پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی بخوبی احساس ہوگا کہ شاعر کس قدر حالات اور وقت کے اُلٹ پھیر کو باریک بینی سے دیکھ اور سمجھ رہا ہے۔ وہ اپنے کلام کے ذریعے مختلف قسم کے معاملات و مسائل کو اُجاگر کرنے کا کام کرتا ہے اور اپنی دل سوزی کو برملا کرتا ہے۔ اگر حالات خوش گوار ہیں تو اُن سے اپنی رضایت کا اظہار کرتا ہے اور جب معاملہ اُس کے برعکس نظر آتا ہے تو اس کے بُرے نتائج سے اپنے کلام کے ذریعے واقف و آگاہ کرانے کا کام بھی کرتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مقبول منظرؔ کہیں نہ کہیں مصلح کا کردار اَدا کر رہے ہیں مگر نری نصیحت کرنے کے بجائے شاعرانہ اسلوب سے کام لے کر تلخ حقائق برملا کرتے ہیں۔ شاعر اور ادیب کی پہچان اُس کی مصلحانہ کاوشیں بھی ہیں جو معاشرے کے لئے وہ بہتر سمجھتا ہے اُسے اپنے اشعار کے ذریعے لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ لیکن ''مصلحِ قوم'' بننے کے بجائے انہوں نے ایک عام انسان کی اپنے سماج کے سلسلے میں جو ذمہ داریاں ہیں اُن کو اَدا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور اس کی بہترین مثال ان کی شاعری سے جو اَدب برائے اَدب کے بجائے اَدب برائے زندگی کی مؤثر تصویر پیش کرتی ہے۔ ظاہر ہے ایک شاعر سے اور توقع بھی کیا کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنے اشعار کے ذریعے عالم انسانیت کی خدمت کر رہا ہے تو یہ بذاتِ خود قابلِ تحسین عمل ہے مجھے اطمنان ہے کہ مقبول منظرؔ جیسا حساس، معاملہ فہم، اور ہَواؤں کا رُخ پہچان لینے والا شاعر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں کامیاب نظر آتا ہے۔

مقبول منظرؔ کی شاعری کا ایک پہلو حق و باطل کی معرکہ آرائی میں حق کی فتح اور باطل کی شکست کا وہ

R.N.I. : BIH URD/2019/78036

CamScanner



منظر نامہ بھی ہے جسے ہم واقعۂ کربلا سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ معرکۂ کربلا کی ہی دین ہے کہ آج ہم اسلام کے نام لیوا روئے زمین پر خدا کی وحدانیت اور انبیائے کرام کی محنت و ریاضت بالخصوص رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا پرچم بلند کرنے میں کامیاب ہیں بقول مقبول منظرؔ ۔

اسلام کا چراغ جو روشن ہے آج بھی
سبطِ نبی کے صبر و رضا کا یہ فیض ہے

یہ فیضان شہید اعظم ہی ہے جنھوں نے بقول منشی پریم چند: ''تہذیب کا رُخ تبدیل کر دیا ۔۔۔وہ ایک خالص روحانی تحریک تھی جس کا منشا دنیا میں استبداد اور ملوکیت کو فنا کر کے مساواتِ عالمگیر کی اشاعت تھی''۔ (پریم چند: شہید اعظم)

عہدِ حاضر کے بہت سے شاعروں نے حقانیت و انسانیت کی پرچم کشائی کے لئے معرکۂ کربلا سے جو نتائج اخذ کئے ہیں انہیں اپنی شاعری میں سمو کر ہمارے لئے پیش کیا ہے۔ عام طور پر یہ کربلائی اشارے کہیں بالکل واضح اور کہیں استعاراتی انداز میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ معرکۂ کربلا حق و باطل میں خط تفریق کھینچتا ہے۔ امام حسین اور اُن کے ساتھ راہِ حق میں جامِ شہادت نوش کرنے والے جیالوں نے اپنی شہادت سے ثابت کر دیا کہ حق کی راہ نہ صرف دشوار اور سنگلاخ ہوتی ہے جس پر چلنے کے لئے شیر کا جگر درکار ہوتا ہے کیوں کہ یہ بہادرانِ راہِ حق بنی نوع انسان کو یہ درس دیتے ہیں کہ ظُلم کی گھنگھور گھٹاؤں میں بھی صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے حق کا ساتھی بنے رہنا چاہیے اور ظلم و استبداد کا ڈَٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ یہ وہ درسِ عظیم ہے جو صدیوں سے محروموں اور مظلوموں کو سخت سے سخت مراحل میں نہ صرف صبر و سکون فراہم کرتا ہے بلکہ استبدادی قوتوں کا ڈَٹ کر مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی عطا کرتا ہے اور درسِ کربلا بھی یہی ہے۔ صدیوں سے شعرا و ادبا اِس معرکۂ عظیم سے اخلاقی فوائد و نتائج حاصل کرتے اور اپنے معاشرے کو گمراہی اور ضلالت سے بچانے کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں اور عاشقانِ پاک طینت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں ۔

بِنا کردند خوش رسمی بہ خون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

مقبول منظر نے بھی واقعات کربلا سے درس بھی لیا ہے اور استفادہ بھی کیا ہے ان کی شاعری میں بھی واضح طور پر معرکۂ کربلا کے اشارے تو کہیں استعاراتی انداز دیکھنے کو ملتے ہیں وہ کہتے ہیں ۔

منظرؔ جو کربلا میں بہا اہلِ حق کا خون　ہر دَور میں رہے گا وہ تازہ زمین پر
ظلم و ستم سے جھکتے نہیں اہلِ حق کبھی　یہ جنگ کربلا سے ستم گر سمجھ گئے

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ روئے زمین کا یہ دلدوز واقعہ تاریخ کی ایک ایسی سچائی ہے جس سے

ISSN : 2582 - 3612

نظریں نہیں چرائی جا سکتیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم معرکۂ کربلا کے مختلف گوشوں پر گہری نظر رکھ کر اپنے معاشرے کی بُرائیوں کو دور کرنے کے ساتھ اسے ارفع واعلا مقام پر پہنچانے کی کوشش کریں کیوں کہ دنیا میں ظلم وستم کی انتہا اور پھر اُن کا مقابلہ کرنے والوں کے صبر اور رضائے الٰہی کے ساتھ اسلام اور انسانیت کی بقا کے لئے راہِ حق میں پیش کی جانے والی قربانیوں کی مثالیں صرف اور صرف میدانِ کربلا میں دیکھنے میں آتی ہیں جو حساس لوگوں کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔

باطل کے آگے سر نہ جھکانے کا عزم کر
سینے میں اپنے جذبۂ حیدر اُتار لے

حاوی یزیدِ وقت ہوا جا رہا ہے کیوں
دَورِ رواں میں جذبۂ حیدر کہاں گیا

پھر کیوں جہاں کو ہو نہ ضرورت حسین کی
ابنِ زیادِ وقت ہے لشکر لئے ہوئے

دکھائیں کمال آپ صبر و رضا کا
ہے گر سامنے معرکہ کربلا کا

ضرورت ہے حسینی لشکروں کی
یزیدی فوج پھر لائی گئی ہے

بن رہی ہے کربلا
وادیِ گنگ و جمن

معرکۂ کربلا اور اُس کے متعلقات کو شاعر نے کس سادگی اور صفائی سے آج کے حالات کی روشنی میں اپنے خیالات کی آمیزش کے بغیر صرف لفظوں سے کام لے کر جو حقائق بیان کئے ہیں وہ ہر دَور کے لئے لازم ہیں۔یعنی جب تیرگی کے بادل چھائیں اور مساوات وانصاف کی جگہ بدعنوانیاں سر چڑھ کر بولیں تو اُن سے ڈَٹ کر مقابلہ کرنے کا حوصلہ سرزمینِ کربلا دیتی ہے۔ جہاں پیاسوں نے پیاس کی شدت اور ظلم کی حدت کو برداشت تو کیا مگر حق وانصاف کا پرچم بلند کئے رکھا اور یہ درس آج بھی ہمارے لئے راہنما ہے۔

مقبول منظر کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔انہوں نے ہر قسم کے موضوع پر بے باکی اور خوبصورتی کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ایسے حقیقت نگار شاعر کو اس کا بھی بخوبی احساس ہے کہ اکثر ناقدین فن جانب دارانہ روّیہ اختیار کر لیتے ہیں جس سے بسا اوقات فنکار سمجھ نہیں پاتا کہ اُسے کس راستے پر چلنا چاہئے۔ایسے ناقدین کو منظر بھی پہچانتے ہیں جبھی تو کہتے ہیں۔

معیارِ نقد جن کا ہے تنقیصِ فن فقط
ہم معتقد نہ ہو سکے اُن ناقدین کے

عصر حاضر کے ہم عصر شعرا میں مقبول منظر خوش گو اور پُر گو شاعر ہیں۔ بلکہ میں تو اُنہیں منفرد بھی کہتا ہوں۔ واقعی ایسے فنکاروں اور قلم کاروں کی مساعی جمیلہ کی قدر کی جانی چاہئے جنہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے عصری مسائل کو موضوعِ سخن بنایا اور اپنی حساسیت کا ثبوت پیش کیا۔اگر فنکاروں کی کاوشوں کا اعتراف کھلے دل سے کیا جاتا رہے گا تو اردو شعر وادب میں قرار واقعی مفید اضافے ہوتے رہیں گے۔مقبول منظر نے


CamScanner



جہاں تلخ وترش رخ اپنایا ہے وہیں انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے اردو شاعری میں مؤثر اور خوش آیند رنگ و آہنگ کے اضافے کے امکانات کو روشن اور حوصلہ افزا بنا دیا ہے۔میں بھی اُن کی دعا پر آمین کہتا ہوں۔

ہوں رائگاں دعائیں نہ منظر کی اے خدا
فکر و ہنر کو اُس کے ملے عمرِ جاوداں

**Prof. Syed Hasan Abbas**
Department of Persian
Banaras Hindu University
Varanasi (U. P.)
Mob.- 98393 37979

پروفیسر ساجد علی قادری

# معاشرتی کجرویوں کا علمبردار: سعادت حسن منٹو

۴۲/سال ۸/ماہ اور ۹/دن جینے والا سعادت حسن منٹو، ادب کا وہ باغی فنکار ہے جس کے قلم کی سیاہی نے سماج کی تلخ حقیقتوں اور معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف ادبی دنیا میں مقدمہ دائر کیا ہے۔ اس عظیم افسانہ نگار نے ادب کو ایک ایسے چہرے سے روشناس کرایا ہے جس کا تصور منٹو سے قبل اردو ادب میں رائج نہیں تھا۔ اس حسین چہرے کے حسن کا دیدار حاصل کرنے کی فطری خواہش سماج کے ٹھیکیداروں کا معنوی ''پیدائشی حق'' ہے۔ منٹو کے اس باغیانہ اور آزاد خیالات نے اُسے ایک جنس پرست مجرم قرار دے دیا۔ جبکہ منٹو نے اپنے افسانوں میں جنسی لذت کے پس منظر میں معاشرے کے حقیقی روپ کو اجاگر کیا ہے۔ اُن کے افسانوں میں سماجی وسیاسی زندگی کی جو کشمکش نظر آتی ہیں دراصل طبقاتی استحصال اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف شدید نفرت ہے۔ غربت اور افلاس کے خاتمے کے لیے منٹو کا دل و دماغ روز نئے نئے منصوبے بناتا ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے افسانے کی تمہید، بیان اور اختتام تک قارائین خاموشی کے ساتھ راز دار بنکر چلتے ہیں۔ اسی راز داری میں معاشرتی ناانصافی کی وجہ سے نیا قانون جنم لیتا ہے۔ ''نیا قانون'' کا استاد منگوں کوچوان کا کردار بغاوت کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ جو کسی قیمت پر اپنے اوپر برطانوی حکومت کا تسلط برداشت نہیں کرتا ہے۔ ہندوستان کو فرنگیوں کے ظلم سے نجات دلانا چاہتا ہے۔ اگر چہ اس کا تعلق معاشرے کے کم درجہ طبقہ سے ہے۔ نیا قانون کے ذریعہ منٹو نے کمزور طبقے کے استحصال کو فن بخشا ہے۔ اس ''نیا قانون'' نے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ ظلم وستم ڈھانے والوں کے لئے کوئی قانون نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ کمزور غریب طبقے کے افراد کی بدقسمتی کا قانون حکومت کی پالیسی میں ضرور ہوتا ہے۔ منگو کوچوان کا خواب نیا قانون انگریزوں کے بغیر بھی نافذ نہیں ہوتا ہے۔ دراصل منٹو اپنی ننگی آنکھوں سے زندگی کی تلخ اور بے رحم سچائی اور حقیقت کو افسانوی رنگ میں پیش کر کے ''انقلاب'' برپا کیا ہے۔

معاشرے کی بدصورتیوں، ظاہر پرستی اور سماجی منافرت کو منٹو نے اپنے افسانوں میں تحریر کر کے ادب کو 360 ڈگری میں گھوما دیا ہے۔ افسانہ ''نعرہ'' کا مونگ پھلی بیچنے والا کیشو لال اپنے مکان مالک کو وقت پر کرایہ نا دینے سے جو ذہنی اذیت سے دوچار ہوتا ہے اسے ''نعرہ'' کے ذریعہ منٹو نے مظلوم لوگوں کے



CamScanner



دکھ اور کرب کو بیان کیا ہے۔ منٹو انسانی نفسیات کا گہرہ نباض ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار کی نفسیاتی شعور دراصل ہمارے معاشرے کے اصل روپ کی حقیقیت کو عیاں کرتی ہیں۔ معاشرتی، معاشی، سماجی اور طبقاتی ناانصافیوں کو منٹو نے آرٹ کا کینوس بنایا ہے۔

منٹو بے باک اور ایک حقیقت نگار تھا۔ اس کا یہ فقرہ اسے ہمیشہ زندہ رکھنے کی دلیل ہے۔ ''منٹو کو اعتراف ہے کہ چکی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان کے ساتھ سو جاتی ہے۔ میرے افسانوں کی ہیروئن نہیں ہوسکتی۔'' منٹو کی ہیروئن ایک عام عورت ہے، جو اس معاشرے میں بستی ہے۔ منٹو نے پہلی دفعہ اردو ادب میں عورت کو مافوق الفطرت مخلوق اور تخیلاتی تصور سے باہر نکال کر گوشت پوست کے روپ میں پیش کیا ہے۔ منٹو کے افسانے کے کردار اسی جہاں کی سیر کرواتے ہیں۔ اور وہ اسی معاشرے کے حصے دار بھی ہیں، جس کا ظاہر اور باطن کچھ اور ہے۔ منافقوں کے ہجوم میں منٹو کا فن ناانصافیوں کو چیلنج کرتا ہے۔ وہ افسانہ ''کھول دو'' میں رضا کاروں کے بھیانک چہرے ہمارے سامنے لاتا ہے۔ تقسیم ہند سے تعلق رکھنے والا یہ افسانہ سماج کے کالے بھیڑوں کی اصلیت کو بے نقاب کرتا ہے :

> ''آٹھ رضا کار نوجوانوں نے ہر طرف سکینہ کی دلجوئی کی۔ اسے کھانا کھلایا۔
> دودھ پلایا اور لاری میں بٹھا دیا۔ ایک نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دے دیا۔
> کیونکہ دوپٹہ نہ ہونے کے باعث وہ بہت الجھن محسوس کر رہی تھی۔ اور بار بار
> اپنے سینے کو ڈھانکنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔''

مذکورہ اقتباس میں رضا کاروں کی ہمدردی کے پیچھے چھپے ہوئے درندے کا نظارہ دیکھئے۔ جو روح تک کو تڑپا دیتا ہے۔ سکینہ سے ہونے والے جبری جنسی استحصال جیسی ناانصافی کھُل کر سامنے آتی ہے۔ اس افسانے کا آخری حصہ معاشرے کی بے حیائی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ منٹو نے اپنے قلم کے متعلق لکھا ہے کہ :

> ''میری تحریریں آپ کو کڑوی اور کسیلی تو لگتی ہوں گی مگر جو مٹھاس آج آپ کو
> پیش کی جا رہی ہے اس سے انسانیت کو کیا فائدہ ہوا ہے؟ نیم کے پتے کڑوے
> سہی مگر خون تو صاف کرتے ہیں۔''

> منٹو کی اس کسیلی بات نے مددگاروں کے بھیانک چہرے کو ہمارے
> سامنے لایا ہیں۔

> ''ڈاکٹر نے جس کمرے میں روشنی کی تھی سراج الدین سے پوچھا۔
> کیا ہے؟''

سراج الدین کے حلق سے صرف اس قدر نکل سکا ''جی میں۔۔۔۔۔

جی میں۔۔۔اس کا باپ ہوں!''

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا۔اس کی نبض ٹٹولی اور سراج الدین سے کہا۔''کھڑکی کھول دو''

سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش پیدا ہوئی۔بوڑھا سراج الدین خوشی سے چلایا، زندہ ہے۔۔۔۔میری بیٹی زندہ ہے۔۔۔۔''

منٹو کے فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کچھ نہ کہہ کر بھی ہمیں ان مکار لوگوں کی مکاری دکھا دیتے ہیں۔افسانہ **کالی شلوار**، میں سلطانہ کو محرم منانا ہے اور اس کے لئے وہ کالی شلوار پہن چاہتی ہے۔جو اس کے پاس نہیں ہے۔ایسی صورتِ حال میں شنکر کی طرف سے جنسی ملاپ کی شرط ہوتی ہے۔شنکر کی یہ شرط معاشرے کی لاج کو داغدار کرتی ہیں :

''تم جیتے، میں ہاری، پر میں کہتی ہوں آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی۔''

معاشرے کی ناانصافیوں کو منٹو نے فن بخشا ہے۔منٹو کی گہری نظر سماج کی ان برائیوں کو فوراً دیکھ لیتی ہے جو شرافت کا لبادہ اوڑھے اپنے آپ کو White Caller کہلاتے ہیں۔منٹو کی نگاہ سے کوئی بھی حقیقت نہیں چھپتی ہے۔منٹو نے اپنی تحریروں میں سلطانہ کی معصومانہ خواہش کو'' کالی شلوار'' سے عیاں کیا ہے، تو شنکر جیسے بے ایمان اور مکار چہرے کو بے نقاب کر کے ناانصافیوں کو مٹانے کی کوشش کی ہیں۔یہی سبب ہے کہ وہ حقیقت کے تمام رنگ کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔اور اس ستم کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے ہیں۔نتیجہ ان پر فحاشیت کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔

منٹو نے زندگی کے دونوں رُخ کو پیش کیا ہے۔سماج کی ناانصافیوں کے خلاف منٹو کا فن اعلانیہ جنگ ہے۔اس جنگ میں وہ تمام تصاویر نظر آتیں ہیں۔جو اس دور میں چلتی پھرتی معلوم ہوتی ہیں۔اب بھی سماج میں وہی گناہ اور جنسی مسائل موجود ہیں۔اس کے خلاف آواز اُٹھانے سے ہم لوگ ڈرتے ہیں۔کیونکہ ہم میں منٹو بننے کی ہمت نہیں ہے۔شاید بن بھی نہیں سکتے ہیں۔منٹو نے اپنے فن کے ذریعہ صرف اپنے عہد کے معاشرتی ناانصافی کو واضح نہیں کیا ہے بلکہ آنے والے ہر عہد کی بے ایمانی اور مکاری کے چہرے کو اجاگر کیا ہے۔افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا بشن سنگھ، سیاسی لیڈروں کے فیصلے کو قبول نہیں کرتا ہے۔وہ ہندستان یا پاکستان میں رہنے کی بجائے ایک درخت کو ترجیح دیتا ہے۔

منٹو حساس دل و زمین کا مالک ہے۔اپنے دور میں سیاسی و سماجی تغیرات کے مثبت و منفی پہلوؤں



CamScanner



سے پوری طرح آگاہی رکھتا ہے۔یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں میں زندگی کی تمام جولانیاں، بڑی شان و شوکت کے ساتھ نظر آتیں ہیں۔اس افسانے کے اختتام نے برصغیر کے سیاسی رہنماؤں کے منھ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا ہے۔بشن سنگھ ہندوستان اور پاکستان کے درمیانی زمین کے اس ٹکڑے پر مرنا پسند کرتا ہے۔جس کا کوئی نام ہی نہیں ہے۔بشن سنگھ کا ''نو مین لینڈ'' معاشرتی ناانصافیوں کا آہنگ ہیں۔

معاشرے کے ناانصافی کے چہرے کو دکھانا ایک فنکار کی ذمہ داری ہوتی ہے۔سماج میں ہونے والی برائیوں کو حقیقت سے اجاگر کرنا اور ان کا حل بتانا ایک ادیب کا بنیادی فریضہ ہے۔اس فریضہ کو منٹو نے بخوبی نبھایا ہے۔

افسانہ ''ہتک''، میں سوگندھی نامی طوائف کی کہانی ہے۔جب تک سوگندھی حسن و شباب کی دیوی تھیں ہر کوئی اس حسن کے سمندر میں غوطہ لگاتا تھا۔سوگندھی کے عشق کا دم بھرنے والا حولدار اُسے شادی کے جھوٹا وعدے کر کے پیسے بٹورتا ہے۔بیچاری اس مکار حوالدار کے فریب میں ہمیشہ پھنسی جاتی ہے۔اس مقام پر منٹو نے عورت کی تصویر کچھ اس رنگ میں کھینچی ہے۔مادھو کرسی پر سے اٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا :

''اور میں نے تجھے ٹھیک دو بجے سپنے میں دیکھا۔۔۔۔جیسے تو پھولوں والی ساڑی۔۔ارے بالکل یہی ساڑی پہنے، میرے پاس کھڑی ہے۔تیرے ہاتھوں میں۔۔کیا تھا؟ تیرے ہاتھوں میں۔۔۔ہاں، تیرے ہاتھوں میں روپوں سے بھری تھیلی تھی۔تو نے یہ تھیلی وہ تھیلی؟ (میری جھولی میں رکھ دی اور کہا: مادھو! تو چنتا کیوں کرتا ہے؟۔۔۔لے یہ تھیلی۔۔۔ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں؟۔۔۔۔سوگندھی تیری جان کی قسم! اٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رخ کیا۔۔۔کیا سناؤں بڑی پریشانی ہے!۔۔۔۔''

جب یہ حسن و جمال ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے۔پھر ایک سٹھ جو کار سے آتا ہے اور اسے دھتکار کر چلا جاتا ہے۔سوگندھی کے لیے یہ ''دھتکار'' اس معاشرے کی اصلی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔جو صرف کمزور نچلے طبقے کا استحصال کرنا اپنا بنیادی حق سمجھتا ہے۔اس افسانے کا اختتام قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔۔۔۔

''اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سوگئی۔۔۔''

سوگندھی کی اس ذہنی کیفیت کے سفر میں منٹو ایک ایمان دار لکھاری نظر آتا ہے۔جو ادب لوگوں کو خوش کرنے کے لیے قلم بند کیا جاتا ہے وہ ادب ادب ہی نہیں ہے بلکہ صرف لفاظی ہوتا ہے۔معاشرے میں

ہونے والے ظلم وستم اور دوغلے رویوں کو اپنے قلم کے ذریعہ عیاں کرنا ہی ایک حقیقی ادیب کا کام ہے۔ اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ منٹو نے اپنے افسانوں میں عورتوں کو بے لباس کیا ہے۔ منٹو نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا ایک ہی جواب میرے سامنے ہے کہ عورتوں کے کپڑے معاشرے اور حالات نے اتارے۔ منٹو نے بس اسے اپنے افسانوں کے ہیروئین کے لیے کاسٹ Cast کیا ہے۔

منٹو کو اپنے فن کی اہمیت کا اس قدر اندازہ تھا کہ خود انھوں نے اپنے مرنے سے پہلے اپنا کتبہ تیار کروایا جس پر یہ عبارت کندہ کروائی :

> ''یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے اس کے سینے میں افسانہ نگاری کے سارے اسرار ورموز دفن ہیں وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا۔۔۔''

**Prof. Sajid Ali Qadri**
Head
Department of Urdu
S. P. D. M. College, Shirpur
Dhulia (Maharashtra)
Mob.- 94232 8878



CamScanner



ڈاکٹر صبیحہ سمیرالدین سیّد

# اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر

اُردو زبان کی بنیاد ہی مختلف زبانوں اور بولیوں کے امتزاج اور مختلف گرہوں کے باہمی اتحاد پر رکھی گئی ہے۔ ابتداء ہی سے اُردو زبان میں قومی اتحاد و اتفاق کے نمایاں نقوش نظر آتے ہیں۔

اُردو ادب کی تاریخ سے ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اُردو زبان نے دیگر زبانوں سے آپسی ربط بنائے رکھا اور نہایت ہی بامروّت اور دوستانہ تعلقات رکھتے ہوئے دیگر زبانوں کے الفاظ کو جذب کیا اور جب خود ایک روادار زبان کا درجہ پالیا تو اس نے قومی و انسانی رواداری کی مثال بن کر حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دیا۔

جدو جہد آزادی ہند میں اُردو شعراء نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اُردو شاعری میں قومی یکجہتی اور امن دوستی کا جذبہ بے شمار شعراء نے ابھارا ہے۔ جن میں امیر خسرو، محمد قلی قطب شاہ میراجی، ولی اورنگ آبادی، حالی، نظیر، چکبست، حسرت موہانی، علامہ اقبال، فیض احمد فیض وغیرہ۔

اُردو کے پہلے شاعر امیر خسرو کے دوہے ہوں، کہ مکرنیاں ان کے گیت ہوں (برہا کے گیت ہوں یا پہیلیاں سبھی میں ہندوستانی مزاج یہاں کی روایت اور تہذیب بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے ہی ایک ہم عصر مراٹھی کے سنت کوئی نام دیو بھی جب ہندوی، ہندی یا آج کی زبان میں اُردو میں شعر کہتے تو ان اشعار میں ہندوستانی تہذیب اور قومی یکجہتی موضوع خاص ہوتا۔

سوریہ نہ ہوتا چندر نہ ہوتا تو نور کہاں تے اُپایا
مائے نہ ہوتی پتر نہ ہوتا کوئی کہاں تے آیا

تقریباً ۶۲ ر اشعار کی اس نظم میں تخلیق آدم سے لے کر انسان دوستی تک کے تمام عناصر مل جاتے ہیں۔

میراجی شمس العشاق کے یہاں تو میل ملاپ کی یہ لئے اور زیادہ اونچی ہو جاتی ہے۔ حمد کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اللّٰہ واحد سر جن ہار
جوں جگ عالم جس تھیس بھار

ISSN : 2582 - 3612

دائم قائم آپیں آپ
جوتا پنگڑی نا ما باپ

محمد قلی قطب اُردو کا پہلا شاعر ہے جس نے ہندوستان کی پوری فضاء کو یہاں کے رسم ورواج کو یہاں کے طرز حیات کو اپنی نظموں میں سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔قلی قطب شاہ نے بسنت، دیوالی، عید وغیرہ پر ایسی نظمیں لکھی تھیں ۔ یہ نظمیں پوری طرح سے ہندوستانی رسم ورواج روایت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

بسنت کھلیں عشق کا آپ یارا
تمہیں ہیں چاند میں جوں ستارا
بند ہوں ، چھند چند سوں کر سنگارا
بسنت کھلیں ہمن سیور ساجنایوں
کہ آسماں رنگ شفق پایاہے سارا

نظیر اکبر آبادی نے اپنی بیشتر نظموں میں حب الوطنی اور دوستی امن کے جذبے کو ابھارا ہے۔ انھوں نے مذہب وملّت ، ہندومسلمان غرض تمام مذاہب کے برگزیدہ ہستیوں کی شان میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔نظیر نے اُردو شاعری کے دھارے کو پورے طور پر گنگا جمنی دھارے میں تبدیل کر دیا ہے۔نظیر کی مذہبی رواداری کا اندازہ اس بند سے لگایا جاسکتا ہے ۔

جھگڑا نہ کرے مذہب و ملّت کا کوئی یاں
جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آن
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قر آن
عاشق تو قلندر ہے نہ ہندو نہ مسلمان
کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا
آخر وہی اللّٰد کا اک نام رہے گا

نظیر اکبر آبادی نے قومی یکجہتی کا جو تصور خیال اپنے شاعری کے ذریعے ابھارا ہے وہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی پہلے باضابطہ محبِّ وطن دانشور ہیں۔جنھوں نے اپنی شاعری اور نثر کو اپنے وطن سے محبت کے سچّے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔حالی محبِّ وطن پیدا ہوئے تھے۔قدرت نے ان کے اندر اصلاح کی لازوال صلاحیت ودیعت کی تھی۔جیسے کے یہ شعر ملاحظہ ہوں ۔



CS CamScanner



بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو
اٹھو اہل وطن کے دوست بنو

''حبِّ وطن'' حالی کی پہلی نظم ہے جس میں بھرپور وطنی جذبے کے ساتھ ان کے سیاسی ،سماجی ، معاشی اور تعلیمی فکر ونظر کا پتا چلتا ہے۔ یہ جذبہ انکا اپنا تھا۔ ہندوستان میں نا اتفاقی کی وجہ سے غلامی کا احساس اس طرح دلاتے ہیں ۔

ہند میں اتفاق ہو تو اگر
کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر

برج نارائن چکبستؔ کی شاعری حب الوطنی ہے۔موضوعات وطنی ہیں۔ ہندوستان تہذیب و تمدن یہاں کی ہر چیز سے محبت چکبستؔ کی شاعری میں ظاہر ہوتی ہیں۔

''صبحِ وطن'' چکبست کے کلام کا مجموعہ ہے۔'صبحِ وطن' کا پہلا حصہ حبُّ الوطنی سے متعلق نظموں پر مشتمل ہے۔جس میں، خاک وطن، ہمارا وطن، وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک۔''خاک وطن'،چکبست کی مشہور نظم ہے۔جس میں ہندوستان کی بڑائی بیان کرتے ہوئے ہمالہ کی عظمت ، رفعت اور اہمیت ،مسرتوں سے لبریز ہوکر ظاہر کرتے ہیں۔ یہ بند ملاحظہ ہوں ۔

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لئے رواں ہے

اُردو ادب میں حبُّ الوطنی پر بات ہو اور علامہ اقبال کا ذکر نہ ہو یہ کیسے ہوسکتا ہے۔اقبال نے قوم کی رہنمائی اپنے عصر کے حالات میں بہتر سمتوں میں کی ۔ جہاں تک اقبال کی حب الوطنی کا تعلق ہے۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے۔اقبال نے ایک مشاعرے میں اپنی نظم ''ہمالہ'' پڑھی۔اس نظم میں ایرانی اور انگریز شعراء کا اثر نمایاں آتا ہے۔اس نظم میں ملک بھر میں ان کو شہرت حاصل ہوئی۔نظم ''ہمالہ'' میں حبُّ الوطنی کا جذبہ نظر آتا ہے۔علامہ اقبال کی نظموں میں ہمالہ،تصویر،ترانہ، ہندی وغیرہ۔ یہ شعر ملاحظہ ہو ۔

رُلاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستان مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

علامہ اقبال کو قدرت نے تغزل کی دولت عطا کرنے میں بہت فیاضی سے کام لیا۔ان کی دوسری نظمیں خصوصاً ''ہندوستان ہمارہ ہے'' جسے ہندوستان کے قومی گیت کی حیثیت حاصل ہے۔جس میں ہندو مسلم دونوں قومیں ہم آہنگ ہو جائیں اور ملک میں اتحاد قائم ہو اس جذبے کو بہت ہی اچھی طرح سے اُبھارا ہے۔سچ تو یہ اقبال کے پیش نظر رنگ نسل اور خون کا زہرناک تعصب تھا۔جس کے خلاف اپنے ردِعمل کا اظہار

کرتے ہوئے انھوں نے کیا تھا۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہند ی ہیں،ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

اقبال نے ہندوستانیوں کو پیار و محبت کا درس دیا۔انھوں نے اپنی تڑپ اور دردمندی کا اظہار اس شعر میں کیا ہے۔

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ذیل کے چند اشعار کے حب الوطنی کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

وطن کی فکر کر نادان مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے چرچے ہیں آسمانوں میں
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیو تا ہے

ان تمام معروضات کی روشنی میں بہ آسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُردو شاعری میں ارضیت، مقاصیت اور انسان دوستی ایسے ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں جس پر پوری اُردو شاعری کی عمارت کھڑی ہے۔

دراصل یہ عنوان ضخیم کتاب کا متقاضی ہے اور اس سلسلے میں کچھ پیش رفت بھی کی گئی ہے۔ یہاں میں نے کچھ اشارے کئے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو شاعری ہر اعتبار سے قومی یکجہتی، حبّ الوطنی، امن، دوستی اور اتفاق و اتحاد کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ہندو بنے گا نہ مسلم بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

**Dr Sabiha Sameeroddin Sayyad**
Associate Professor
Department of Urdu
Night College of Arts & Commerce
Ichalkranji (Maharashtra)
Mob.- 94206 25171



CamScanner



ڈاکٹر پنکج کانت راجن

# قومی یکجہتی کا علمبردار: نظیر اکبر آبادی

زمانۂ قدیم ہی سے ہندوستان مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔دوسرے ممالک کے لوگ یہاں مختلف اغراض و مقاصد کے تحت یہاں آتے رہے ہیں۔ یہ لوگ مختلف مذاہب کے ماننے والے تھے۔مختلف زبانوں اور تہذیبوں سے ان کا تعلق تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے طریقہ بود و باش، تقریبوں، تہواروں فنون لطیفہ، مذہب اور زبانوں وغیرہ کا فرق ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں چکھا جاسکتا ہے۔اس لیے ان سب میں اختلافی امور کے باوجود بحیثیت ایک قوم کے یکجہتی اور اتحاد نہ ہو ملک میں استحکام پیدا نہیں ہوسکتا۔ملک میں بھائی چارگی اور اتحاد کا جزبہ پیدا کرنے کے لیے جہاں بہت سے طریقے عمل میں لائے گئے ہیں وہیں اور شعراء نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔اس سلسلے میں نظیر اکبر آبادی کا نام ناقابل فراموشی ہے۔

نظیر اکبر آبادی اس کے اپنے شاعر ہیں جن کو ہندوستان کا جمہوری اور عوامی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔انھوں نے اپنے وطن سے بے پناہ محبت کی، ان کو ہندوستان کی ہر کوئی بڑی چیز سے عشق ہے۔جس کا اظہار بھی ان کے یہاں خوب ملتی ہے۔نظیر کی بیشتر نہیں رواداری بے تعصبی کی اعلیٰ مثال ہیں۔اس سلسلے میں فاروق ارگلی کی رائے بہت اہم ہے وہ لکھتے ہیں کہ :

''نظیر اکبر آبادی فطرت اور زندگی کے شاعر ہیں فطرت کا ہزار رنگ حسن و جمال اور حیات انسانی کے گونا گوں پہلو نظیر کی شاعری میں پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتے، ہمکتے، مچلتے اور لہراتے نظر آتے ہیں دیگر بلاشبہ، ہندوستان کے سعدی اور شیکسپیر ہیں۔''!

(انتخاب کلام نظیر اکبر آبادی،ص۔3)

ہولی، دیوالی، اور رکشا بندھن کے پہلو بہ پہلو نظیر نے ہندو دیوی دیوتاؤں کی شان میں بھی عقیدت سے پُر نظمیں کہی ہیں۔نظیر کی اس طرح کی نظموں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ محبت اور اتحاد کا پیغام دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ISSN : 2582 - 3612

اردو زبان کے اس اوّلین شاعر کی پیدائش یوں تو دہلی میں 1739ء کے آس پاس ہوئی۔ یہ وہ دور ہے جب مغلیہ سلطنت آخری سانس لے رہی تھی۔ ادھر نادر شاہ درّانی کے حملے نے دہلی کو پوری طرح تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ان پُر آشوب حالات میں دہلی سے بہت سے لوگ ہجرت کر دوسرے شہروں میں سکون تلاش رہے تھے۔ اسی کشاکش میں نظیر کا خاندان دہلی سے اکبر آباد یعنی آگرہ میں آباد ہوا۔

نظیر فطری طور پر دین اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے اسی وجہ سے کئی زبانوں پر مکمل دسترس حاصل تھی اور انھوں نے اپنے شوق اور لگن سے عربی، اور فارسی کے علاوہ سنسکرت، ہندی، مارواڑی، پوربی، اور پنجابی بولیوں میں بھی خاصی مہارت حاصل کی تھی۔ اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ مندروں کی مذہبی روایات، رسم و رواج اور عقائد سے بھی گہری دلچسپی تھی دراصل نظیر ہندوستان کی گنگا جمنی مشترکہ تہذیب کی مکمل تصویر کہے جا سکتے ہیں۔

دیگر کا کلام ہندوستان کی اسی پُر رنگی سے بھرپور ہے۔ اردو زبان یا دیگر زبانوں میں بھی ایسے کم ہی شاعر پیدا ہوتے ہی جن کے یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی روایات، معاشرت، اور رسم و رواج کو اس خوبصورتی سے پیش کیا ہو جیسا کہ نظیر نے اپنی شاعری کے ذریعہ پیغامات دیئے ہیں۔

جنم کنہیا جی، ہاُرمی، کنہیا جی کا راس، کنہیا جی بال پن، مہادیو جی کا سیاہ گرونانک شاہ، بلدیو جی کا میلا، ہولی، ہولی کی بہاریں، دوالی، راکھی کا تہوار جوگی نامہ درگا جی کے درسن، بھیروں جی کی تعریف وغیرہ نظیر کی وہ شاہکار نظمیں ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اتحاد و محبت کے بڑے پیغامات پوشیدہ ہیں۔

نظیر کا نظریہ اور ہندو دیوی دیوتاؤں سے ان کی والہانہ محبت و عقیدت آج ہندوستانی عوام کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ مذہب کا مقصد انسان کو ایک دوسرے کے قریب لانا ہوتا ہے نا کہ دلوں میں نفرت کے بیج بونا۔ نظیر کی ان نظموں سے میل و محبت کی ایک خوبصورت فضا قائم ہوتی ہے جس کی آج بے حد ضرورت ہے۔

بھیرو جی کی تعریف میں نظیر نے جو نظم کہی ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں۔

کیا کیا مچی ہیں تیرے، دربار کی بہاریں
بھگتی کلا پہ تیری، جی جان اپنا واریں
سب اپنا اپنا کارج من مانا سنواریں
سیوک چرن کو چومیں، اشٹی کھڑے پکاریں
تیری سرن کہی ہے، کر تو نہال بھیروں
اے پرت پال دیوت، مدھ مست کال بھیروں

R.N.I. : BIH URD/2019/78036

CamScanner



درگا جی کے درشن پر بھی نظیر نے جذبات سے پُر ایک نظم کہی ہے جس کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں۔

من باس نہ کہیئے کیوں کر، جی ہے کاشی نگری برسن کی
ہے تیر گیانی دھیانی کا ہر پنڈت اور دھن سرسن کی
جو بسنے ہارے دور کے ہیں یہ بھوم ہے اُن من ترسن کی
اس دیوی نٹ کھٹ کے ہے چاہ چرن کے پرسن کی
پرسند من بہت ہوتے ہیں یہ ریت رچی ہے ہرسن کی
تعریف کروں میں کیا کیا کچھ اب درگا جی کے درسن کی

نظم ''مہادیو جی کا بیاہ'' میں نظیر نے شادی کی تمام تر تفصیلات کو نہایت فطری اور حسین انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی نظم ''بانسری'' کا یہ بند بھی ملاحظہ فرمائیں۔

بنسی کو مُرلی دھر جی بجاتے گئے جدھر
پھیلی دھن اس کی روز ہر اک دل میں کر اثر
سنتے ہی اُس کی دھن کی حلاوت اِدھر اُدھر
منھ چنگ اور نے کی دُھنیں دل سے بھول کر
سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

اس نظم کا یہ بند بھی بہت اہم ہے ملاحظہ فرمائیں۔

کتنے تو اُس کی دھن کے لئے رہتے قرار
کتنے لگائے کان اُدھر رکھتے بار بار
کتنے کھڑے ہو راہ میں کر رہتے انتظار
آئے جدھر بجاتے ہوئے شیام جی مرار
سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

نظیر کی ایک اور خوبصورت نظم کنہیا جی کی راس کا یہ بند بھی ملاحظہ فرمائیں۔

حلقہ بنا کے کشن جو ناچیں ہیں ہاتھ جوڑ
پھرتے ہیں اس مزے سے کہ لیتے ہیں دل مڑوڑ

ISSN : 2582 - 3612

آ کر کسی کو پکڑے ہیں دیں ہیں کسی کو چھوڑ
یہ دیکھ دیکھ کسی کا آپس میں جوڑ جوڑ
ہر آن گوپیوں کا یہی مکھ بلاس ہے
دیکھ بہاریں آج کنہیا کی راس ہے

نظیر نے صرف ہندو دیوی دیوتاؤں پر نظمیں کہیں بلکہ سکھوں کے پیشوا گرونانک کی شان میں بھی نظم کہی ہے اس سے قبل یہ مثال شاید ہی کہیں ملے کہ کسی شاعر نے گرونانک پر اتنی بہترین نظم کہی ہو۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیں۔

ہیں کہتے نانک شاہ جنہیں، وہ پورے ہیں آگاہ گُرو
وہ کامل رہ بر جگ میں ہیں یوں روشن جیسے ماہ گُرو
مقصود، مراد، امید، سبھی بر لاتے ہیں دل خواہ گُرو
نت لطف وکرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گُرو
اس بخشش کے، اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گُرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہردم بولو واہ گُرو

نظر کی شاعری میں مذہبی رواداری اور انسانی محبت کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ نظیر کا کلام بالکل اچھوتا ہے جس پر کسی کا عکس نہیں نظیر کی پوری شاعری کا مطالعہ کریں تو ہمیں ان کی بہت سی ایسی نظمیں ملیں گی جن میں نظیر قومی یکجہتی کے تعلق سے بڑی عام فہم زبان میں بڑی بڑی باتیں آسانی سے کہتے جاتے ہیں۔ جس کی مثال اب بھی ہمیں کم ہی دیکھنے کو ملے گی۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے زمانے کے دوسرے شعراء اور اہل دانش نے نظیر کے کلام کی وہ قدر نہیں کی جس کے وہ حقدار تھے مولانا محمد حسین آزاد نے بھی اپنے تذکرہ آب حیات میں ان کو کوئی جگہ نہیں دی جبکہ تاریخی اعتبار سے بحیثیت شاعر نظیر کے مقام و مرتبے کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

**Dr. Pankaj Kant Rajan**
Associate Professor
Department of Urdu
Zakir Hussain College (Evening)
Delhi
Mob.- 92506 56116



CamScanner



ڈاکٹر ظہور احمد مخدومی

# رسا جاودانی کی اُردو شاعری: ایک مطالعہ

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کے فروغ وارتقاء میں جہاں صوبہ جموں کے شاعروں، ادیبوں، عالموں اور مورخوں نے ایک اہم رول ادا کیا ہے وہیں صوبہ جموں میں واقعہ قصبہ بھدرواہ صرف اپنی خوبصورتی کی وجہ سے مشہور نہیں بلکہ یہاں سے کئی علمی وادبی شخصیات نے جنم لے کر اس خوبصورت، سرسبز وشاداب وادی کو علمی وادبی دنیا میں ایک منفرد مقام عطا کیا ہے۔ اس حسین وجمیل وادی سے رسا جاودانی جیسے بلند پائے کے شاعر بھی پیدا ہوئے جو کسی تعارف کے محتاج نہیں ہے۔ رسا جاودانی کی پیدائش ایک تاجر گھرانے میں ہوئی جہاں پر انہیں بڑے لارڈ و پیار سے پالا پوسا گیا اور روایتی انداز میں ان کی تعلیم وتربیت کی گئی۔ اگر چہ کچھ عرصے کے لئے ان کا من پڑھائی کی طرف کچھ خاص مائل نہ تھا جس کی وجہ سے بیچ میں پڑھائی کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ بچپن سے ہی رسا کافی محنتی اور ذہین تھے انھوں نے اُردو، فارسی اور انگریزی کتابوں کا مطالعہ کر کے ان زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ لڑکپن سے شعر فہمی کا شوق تھا کیفی، سیماب لکھنؤی اور حفیظ جالندھری کے ساتھ مراسم کی وجہ سے ان کی شاعری میں نکھار آگیا اور یوں شعر وادب کی دنیا میں اپنی گراں قدر خدمات انجام دے کر مشہور ومعروف ہوئے۔

رسا کی اُردو شاعری کا پہلا مجموعہ ''لالہ صحرا'' کے نام سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ترمیم واضافے کے ساتھ دوبارہ ''نظمِ ثریا'' کے نام سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ رسا صرف اردو کے ہی شاعر نہ تھے بلکہ کشمیری زبان کے ساتھ بھی ان کا تعلق گہرا تھا۔ کشمیری زبان میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''تحفۂ کشمیر'' ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا جسے ترمیم واضافے کے ساتھ دوبارہ ''نیرنگِ غزل'' کے عنوان سے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا گیا۔ رسا جاودانی کے اُردو اور کشمیری کلام کو ''کلیات رسا جاودانی'' کے نام سے اردو اور کشمیری زبان کے مشہور شاعر، مورخ، محقق ونقاد اسیر کشتواڑی نے ترتیب دے کر ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔ اس کلیات میں رسا جاودانی کا وہ غیر مطبوعہ کلام بھی شامل کیا گیا جو ۱۹۶۲ء کے بعد شائع نہ ہوسکا۔ حال ہی میں رسا جاودانی کی کلیات کو کچھ ترامیم اور اضافوں کے ساتھ دوبارہ بہت ہی دیدہ زیب طریقے سے عثمان اینڈ سنز، سری نگر کے اہتمام سے شائع کیا گیا۔

رسا جاودانی کا شمار اُردو زبان وادب کے منفرد اور عظیم المرتبت شاعروں میں ہوتا ہے۔ آپ خودار

ISSN : 2582 - 3612

اور خدا ترس انسان ہونے کے ساتھ سیدھے سادھے انسان تھے۔ آپ کی انسانی ہمدردی اور مذہبی ہم آہنگی کے بارے میں وادیِ چناب کے مشہور مصور، محقق و شاعر پروفیسر شاذ شرقی لکھتے ہیں:

''رسؔا صاحب نے ہمیشہ اپنی زندگی دوسروں کے لئے نمونے کے طور پر پیش کی، اُن کے دل میں انسانی ہمدردی اور مذہبی ہم آہنگی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، انھیں مذہب کے نام پر دنگے فساد قطعی طور پر ناپسند تھے، انھیں ریا کاری اور جعل سازی سے انتہائی نفرت تھی، زمانے اور معاشرے کی خستہ حالی سے ان کے نازک دل پر چوٹ لگتی تھی، کیوں کہ قدرت نے اُن کو بہت ہی حساس اور درد بھرا دل بخشا تھا۔ وہ تعصب سے ہمیشہ ہی دور رہ کر امن و آشتی اور قومی یکجہتی کے سدا علمبردار رہے۔'' [1]

رسؔا نے اُردو شاعری کی متعدد اصنافِ سخن حمد، نعت، غزل، نظمیں اور گیت کے علاوہ قطعات لکھ کر اُردو شاعری کے دامن کو وسیع کر دیا۔ اپنے ماضی خاص طور پر بچپن کو یاد کر کے کئی نظمیں ''بیتے دن''، ''فراق طفلی''، ''بچپن کی یاد''، ''سچی خوشی'' لکھ ڈالی۔ یقیناً بچپن ہماری زندگی کا سنہری دور ہوتا ہے۔ بچپن کی حسین یادیں تا عمرِ ہمارے دل و دماغ پر حائل رہتی ہے اور اکثر شعراء نے ان خوبصورت یادوں کو صفحہء قرطاس پر رقم کیا ہے۔ رسؔا نے بھی اپنے بچپن کی ان حسین یادوں کو نظم کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہو۔

وہ چاند تارے اور تھے
سارے نظارے اور تھے
کیا دن وہ بچپن کے بھلے
کیا کیا تھے اپنے مشغلے
تتلی کے پیچھے دوڑنا
ٹِڈوں کی ٹانگیں توڑنا

(بیتے دن)

وہ میرا بچپن کہ میری عمرِ رواں کا
تھا بہترین حصہ
تمام ہوتے ہیں جس کا آغاز
ہو گیا میرے غم کا قصہ

(فراقِ طفلی)





وہ بچپن کی معصوم تھی زندگی
کہ ہر وقت رہتی تھی خورسندگی
نہ تھا مجھ کو پینے کا کھانے کا غم
مگر اب تو ہے اِک زمانے کا غم
ستاتی نہ تھی کوئی دنیا کی بات
تھی مکتب سے گھر تک میری کائنات
خوشی ہی خوشی مجھ کو ہر طور تھی
وہ بچپن کی دُنیا ہی کچھ اور تھی

(بچپن کی یاد)

رسؔا کی شاعری کا بنیادی موضوع پیغامِ انسانیت ہے ان کے نزدیک سب سے بڑا مذہب انسانیت کا ہے۔ وہ ہر مذہب کا احترام کرتے ہیں وہ مذہبی ہم آہنگی اور آپسی بھائی چارے کے روادار تھے ان کے کلام میں قومی یکجہتی کا درس بھی ملتا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہو۔

کبھی نہ مسجد و مندر میں امتیاز کروں
بتوں کی کر کے پرستش ادا نماز کروں

مجھے ایسے مذہب سے اے رسا نہ ہے واسطہ نہ ہے رابطہ
جہاں خونِ مُردم حلال ہے جہاں سُرخ پانی حرام ہے

ایسی بستی ہو جہاں لوگ ہوں سارے انسان
کوئی ہندو ہو وہاں اور نہ مُسلمان کوئی

انسانیت کے پیغام کو عام کرنے والا شاعر جب انسان کو انسانی معیار سے ہٹ کر انسانیت سوز کام کرتا دیکھتا ہے تو بہت ہی دُکھی ہوتا ہے اور اپنی تکلیف کو اس طرح شعری پیراہن میں پیش کرتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو۔

نسل آدم کو کیا ہوا اے رسؔا — ہے درندہ بشر بشر کے لئے
ہائے انسان کے کام ہیں ایسے — آدمیت ہی جس سے شرمائے
نسل آدم سے ہے جہاں معمور — آدمی اِس جہاں میں تھوڑے میں
آدمیت کے روپ میں اکثر — ریچھ، بندر، گدھے ہیں گھوڑے ہیں

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو بہت ہی حسین و جمیل بنایا ہے۔ ادبی دنیا میں کوئی ایسا شاعر نہ ہوگا



CS CamScanner

جس نے فطرت کے دلکش اور خوش نما مناظر کو اپنی شاعری کا موضوع نہ بنایا ہو رسؔا نے بھی ان مناظر فطرت کو جس نظر سے دیکھا ویسا ہی اپنی شاعری میں بھی برتا ہے۔ جذبات کی اس سچائی کی وجہ سے ان کی شاعری اور دلکش بن جاتی ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہو۔

حُسن انسان کو حسن فطرت کا
ہم نے لبِ لُباب دیکھا ہے
آ کہ مل کے روئیے اے عندلیب
تو فدا گل پر ہے میں گلفام پر
ہر پھول اُس کا جلوہ ہے، تو ڈھونڈتا جس کو پھرتا ہے
وہ راز سراسر افشا ہے، پھر راز سے تو محرم بھی نہیں

مندرجہ بالا اشعار میں جو سادگی، شگفتگی اور فطری پن موجود ہے اسی سے متاثر ہو کر اُردو زبان وادب کے بلند پایہ ادیب، نقاد اور تاریخ دان سید محی الدین قادری زورؔ نے رسؔا کو فطری شاعر قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''رسؔا جاودانی ایک فطری شاعر ہیں۔ ان کا کلام تکلف اور آورد سے پاک نظر آتا ہے۔ وہ غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی۔ ان کی نظمیں معانی اور مطالب کے لحاظ سے نظیرا کبر آبادی کے ہم دوش ہیں۔ ان کی عمر بھی نظیر کی طرح پڑھنے پڑھانے میں گذر گئی ہے۔ رسؔا صاحب کی غزلیں اُن کی نظموں سے زیادہ پسندیدہ ہیں۔ ان کی غزل زیادہ تر سادگی اور سلاست کی آئینہ دار ہے۔ خواجہ میر درد اور مصحفیؔ کا رنگ ان کے اشعار میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔''۲

رسؔا کی عشقیہ شاعری میں بھی فطری پن کا احساس ہوتا ہے۔ عشق کا تصور مختلف شعراء کے یہاں مختلف انداز میں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں عشق کے تصور میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ عشق کے موضوع کو شاعری میں بنیادی حیثیت حاصل ہے اور عشق کی وجہ سے غم وجود میں آتا ہے۔ رسؔا عشق کے معاملے میں مثبت نظریہ رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری معنی خیز بن جاتی ہے۔ ان کے یہ اشعار دیکھئے۔

چھوڑا نہ عشق نے بھی کبھی زندگی کا ساتھ
غمِ عشق سے جُدا نہ ہوا پھر بھی ہم جیے
منزلِ عشق کچھ نہیں آسان
یہاں مجنوں سے لوگ گھبرائے



CS CamScanner



جب رہِ عشق میں قدم ہے رسؔا
پھر یہ اندیشہ خطر کیا ہے

رسؔا جاودانی کی مجموعی شاعری میں سچائی و بے باکی نظر آتی ہے سیدھے سادھے لفظوں میں انھوں نے تلخ پیغام بڑے اچھوتے انداز میں پیش کئے ہیں۔ ریاکاری سے انھیں بہت زیادہ نفرت تھی اور خاص طور پر زاہد کی ریاکاری دیکھ کر وہ کہہ دیتے ہیں۔

زاہد تُو ریا کی نہ عبادت پہ ناز کر
دوزخ کے ساتھ تو تیری جنت بدل گئی

اُستاد کا پیشہ اہم اور معزز پیشہ ہے جو کسی بھی معاشرے کی تعمیر وترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں اس پیشے کی قدر نہیں اور نہ ہی وہ عزت ومقام حاصل ہے جو ترقی یافتہ ممالک میں ہے۔ رسؔا جیسا حساس شاعر جب ان حالات کا سامنا کرتا ہے تو وہ بہت ہی خوبصورت انداز میں یوں شکوہ کرتا ہے۔

جس ملک میں افلاس سے نالاں ہے اُستاد
اُس ملک کی تہذیب سے فریاد ہے فریاد
کیا اوروں کو زندوں کا تصور دے گا وہ
خودِ فکر معیشت سے نہیں معلم بھی آزاد
مدرس کو ہوا کھانے کی صلح دینے والو
رکھتے ہیں عمارت کی ہَوا پر نہیں بنیاد

رسؔا جاودانی کی شاعری میں ایسے بے شمار اشعار موجود ہے جو ذہن میں عجیب سی ہلچل مچا دیتا ہے اور ہر پڑھنے والے کی دلی کیفیات پر طاری ہو جاتے ہیں۔ آسان اور سادہ لفظوں میں بڑی بات کہنے کا ہنر ان میں موجود تھا۔ رسؔا میر سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ انھی کی پیروی کرتے ہوئے مختصر اور لمبی بحروں کا استعمال کیا ہے جہاں ان کی مختصر بحروں والے اشعار میں ادبی چاشنی نظر آتی ہے وہیں ان کی لمبی بحروں میں کہے گئے اشعار میں اثر آفرینی اور نغمگی نظر آتی ہے۔ مختصر بحر میں یہ اشعار دیکھئے۔

خضرؑ مجھ سے ملیں تو میں پُوچھوں　　مدعا عُمر جاودانی کا
دستوں کو سمجھتے ہو دشمن　　کچھ تو حد بھی ہے بدگمانی کی
بات اُن سے نہ کچھ زبانی کی　　دل کی آنکھوں نے ترجمانی کی

لمبی بحر میں یہ اشعار ملاحظہ ہو۔

آرام سے سننے والو! کہو آرام کسے تم کہتے ہو
اس دنیا میں آرام نہیں! جس دنیا میں ہم رہتے ہیں
ہر پھول میں اُس کا جلوہ ہے، تُو ڈھونڈتا جس کو پھرتا ہے
وہ راز سراسر افشا ہے، پھر راز سے تُو محرم بھی نہیں

بحروں کے اس خوبصورت استعمال کی بابت اُردو زبان وادب کے معروف ادیب اور ناقد پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں :

''غزل سے رسا کی طبعی مناسبت ہے اور اس صنف میں ان کی طبیعت کے جوہر نمایاں ہوئے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بحریں انھیں مرغوب ہیں اور اپنے سادہ انداز اظہار میں میر تقی میر جیسا اثر پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی غزل کا ایک اور نمایاں وصف یہ ہے کہ اس میں رومانیت کم لیکن غور وفکر کی پرچھائیں زیادہ نمایاں ہیں۔ رسا کے تغزل میں بھی ایک خاص انفرادیت ہے۔'' ۳

رسا جاودانی کی شاعری کے عمیق مطالعے سے یہ نتیجہ باسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری سماجی تقسیم کو ختم کرنے اور دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ ان کے کلام میں امن، پیار، رواداری، محبت، انسانیت اور مذہبی ہم آہنگی جیسے موضوعات حاوی ہیں۔ اپنی شاعری میں انہوں نے پوری دنیا کو محبت کا درس دے کر فلسفہ بقائے باہمی کو فروغ دینے کی بات کی ہے ان کا یہ اچھوتا انداز اور منفرد لہجہ انہیں اپنے دور کے دیگر شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔


۱۔ کلیاتِ رسا جاودانی: تنویر ابن رسا جاودانی، ص۔۶۱
۲۔ نظم ثریا: رسا جاودانی، ص۔۶
۳۔ صوبہ جموں کے اُردو قلمکار (حصہ اوّل): ولی محمد اسیر کشتواڑی، ص۔۵۷



**Dr. Zahoor Ahmad Makhdoomi**
Assistant Professor
Departnemt of Urdu
Govt. Degree College, Sogam
Kupawara (Jammu & Kashmir)
Mob.- 90868 05001




CS CamScanner



ڈاکٹر صفیہ فاطمی

# ایک مشہور لیکن گمنام افسانہ نگار: احمد علی

عنوان کچھ عجیب سا ہے پھر بھی سچائی پر مبنی ہے۔ کئی قد آور ادیبوں کو اُردو ناقدین نے بھلا دیا۔ بھولی بسری یادوں میں ایک اہم نام کلکتہ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اور انگریزی شعبہ کے صدر احمد علی کا بھی ہے۔

سال 1932 میں ''انگارے'' کی اشاعت کے ساتھ ہی احمد علی کی شہرت برصغیر ہندوستان سے لے کر پورے یوروپی ممالک تک پہنچ گئی۔ اس وقت احمد علی کی عمر بائیس سال سے کم تھی۔ اتنی کم عمر میں دنیا کے شہرت یافتہ مصنفین کی فہرست میں شامل ہونے کا اعزاز شاید صرف احمد علی کو حاصل ہے۔ اس مصنف نے افسانہ نگاری کی ابتدا انگریزی زبان میں کی تھی۔ زمانۂ طالب علمی میں ان کا تحریر کردہ انگریزی افسانہ "When the funeral was crossing the bridge" لکھنؤ یونیورسٹی جرنل ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔ لیکن بعد کے کسی افسانوی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں احمد علی کی دو انگریزی نظم Flowers in Basket اور Lake of Dreams شائع ہوئی۔ احمد علی کا پہلا اُردو افسانہ ''مہاوٹوں کی ایک رات'' اس وقت کے مشہور ادبی جریدہ ''ہمایوں'' لاہور Annual نمبر جنوری 1932ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ بات 1931ء کے اخیر کی ہے۔ وہی افسانہ ''انگارے'' میں بھی شائع ہوا۔ انگارے میں احمد علی کا ایک اور افسانہ ''بادل نہیں آتے'' کے عنوان سے ہے۔ دونوں افسانوں میں تانیثیت، پرولتاریت اور جذبۂ حب الوطنی کی بھرپور عکاسی ہے۔ احمد علی کے افسانوں کے بارے میں عزیز احمد رقم طراز ہیں :

''انگارے کے مصنفین میں احمد علی صاحب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔
............انگارے میں بھی بہترین افسانے احمد علی ہی کے ہیں۔''
(ترقی پسند ادب، مصنف عزیز احمد، ناشر کاروان ادب ملتان، ص۔120)

اسی طرح احمد علی کے بارے میں اُردو کے ایک مشہور ناقد اسلوب احمد انصاری کا خیال ہے :

''اس میں احمد علی ہی کے دو افسانے ''مہاوٹوں کی ایک رات'' اور ''بادل نہیں

ISSN : 2582 - 3612

آتے'' بس غنیمت ہیں۔ فنی گرفت کے کمزور ہونے کے باوجود انہیں آزاد تلازمہ خیال کی تکنیک کو برتنے کی ایک کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان میں اس رویے اور رجحان کی آہٹ ملتی ہے جو بعد میں نکھر کر احمد علی کے بعض معرکتہ الآرا افسانوں میں نمایاں ہوا اور ان کی پہچان بنا۔''

(ششماہی نقد ونظر، علی گڑھ، جلد ۱۶، شمارہ ۱۰، ص ۲)

اوک لینڈ یونیورسٹی Oakland University میں اردو، ہندی اور سنسکرت کے استاد کارلو کوپولا Carlo Coppola رقم طراز ہیں:

" Ahmed Ali was the only real wriler in Angare Group

(Article : the short stories of Ahmed Ali, Article written by Carlo Coppola included in Journal of south Asian literature volume : xiii, Year 1977-78, Page 215)

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے 1995ء میں افسانوی مجموعہ انگارے کو شائع کیا تھا۔ اس کے صفحہ نمبر 66 پر خالد علوی نے احمد علی کے تعارف میں لکھا ہے :

''انگارے کے افسانوں میں فنی اعتبار سے مکمل افسانے احمد علی کے ہی ہیں۔''

اردو کے بیشتر ناقدین، مورخین، اساتذہ اور طلباء نے احمد علی کے مذکورہ دو افسانوں کو دیکھا اور اس کے آگے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ سچ پوچھیے تو یہ دونوں افسانے مبتدی کی تحریر ہیں۔ انڈسٹری کی زبان میں اسے اپرینٹس شپ Apprentice-Ship کہتے ہیں۔ خشت اوّل کے بعد پوری عمارت پر غور کرنا دیدۂ بینا کا کام ہے۔ افسانوی مجموعہ ''انگارے'' میں احمد علی کی حیثیت شریک مصنف کی تھی۔ 1936ء میں ان کا افسانوی مجموعہ ''شعلے'' کے نام سے شائع ہوا جس میں سارے افسانے احمد علی کے ہیں جس کی اشاعت ادارہ نیا سنسار الہ آباد نے کی تھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ اُردو لاہور نے 1938ء میں شائع کیا۔ اس مجموعہ میں بارہ افسانے شامل ہیں۔

| | |
|---|---|
| ۱۔ تصویر کے دو رخ | ۱۲ر صفحات میں |
| ۲۔ استاد شمو خاں | ۱۶ر صفحات میں |
| ۳۔ شادی | ۱۲ر صفحات میں |
| ۴۔ اس کے بغیر | ۱۸ر صفحات میں |
| ۵۔ ہمارے ماسٹر | ۱۱ر صفحات میں |





| | |
|---|---|
| ۶۔ چھپر کھٹ | ۷ر صفحات میں |
| ۷۔ اس کے تحفے | ۱۱ر صفحات میں |
| ۸۔ نوروز کی رات | ۱۲ر صفحات میں |
| ۹۔ غلامی | ۶ر صفحات میں |
| ۱۰۔ موٹر لاری کا سفر | ۱۷ر صفحات میں |
| ۱۱۔ مزدور | ۱۰ر صفحات میں |
| ۱۲۔ آنکھیں | ۱۳ر صفحات میں |

افسانوی مجموعہ میں شائع ہونے سے قبل یہ سارے افسانے مختلف جرائد میں شائع ہو چکے تھے۔ شعلے کی اشاعت سے قبل یا اسی کے آس پاس ایک انگریزی افسانہ ''آور لین'' "Our Lane" کے نام سے انگلینڈ کے انگریزی جریدہ New Writings میں شائع ہوا۔ اس جریدہ کا پہلا شمارہ 1936ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ جس کے سربراہ جان لیہمان John Lehmann تھے۔ پہلے شمارہ میں درج ذیل قلم کاروں کی تحریر شامل تھی۔

W.H. Auden
V.S Pritchett
Christopher Isherwood
Tom Wintringham
Stephen Spender
Ahmed Ali
Jim Phelan
Rex Warner
B.L. Coombes

قلم کاروں کی یہ فہرست واضح کرتی ہے کہ ہندوستانی نژاد صرف ایک مصنف احمد علی اس میں شامل ہے۔ اُردو کی شکل میں یہ افسانہ ''ہماری گلی'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اسی عنوان یعنی ہماری گلی کے نام سے احمد علی کا افسانوی مجموعہ سال 1942ء میں انشاء پریس دہلی نے شائع کیا، طباعت دلی پرنٹنگ ورکس دہلی کی ہے۔ اس مجموعہ میں سات صفحات پر مشتمل مصنف کا پیش لفظ ہے۔ اس کے بعد سات افسانے ہیں۔ یہ افسانوی مجموعہ ہندوستانی اکیڈمی لائبریری الہ آباد میں موجود ہے۔

| | |
|---|---|
| ہماری گلی | ۳۰ رصفحات میں |
| میرا کمرہ | ۲۲ رصفحات میں |
| شکنتلا | ۱۰ رصفحات میں |
| مسٹر شمس الحسن | ۲۱ رصفحات میں |
| مارچ کی ایک رات | ۳۱ رصفحات میں |
| شراب خانہ میں | ۸ رصفحات میں |
| نوروز کی شام | ۹ رصفحات میں |

یہ سارے افسانے اُردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ ہماری گلی کی اشاعت تیسری بار بھی دہلی سے ہوئی۔ آگے چل کر عکراش پبلشنگ کراچی نے اسے شائع کیا۔

واضح ہو کہ ''نوروز کی رات'' اور ''نوروز کی شام'' الگ الگ افسانے ہیں۔

احمد علی کا چوتھا افسانوی مجموعہ ''قید خانہ'' کے نام سے انشاء پریس دہلی نے جون 1944ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کا ایک نسخہ ہندوستانی اکیڈمی لائبریری الہ آباد میں موجود ہے۔ اس مجموعہ میں سات صفحات پر مشتمل مصنف کا پیش لفظ ہے۔ اس کے بعد چار افسانے ہیں۔

| | |
|---|---|
| قید خانہ | ۳۱ رصفحات میں |
| پریم کہانی | ۲۶ رصفحات میں |
| قلعہ | ۲۸ رصفحات میں |
| گزرے دنوں کی یاد | ۱۳ رصفحات میں |

احمد علی کا آخری اُردو مجموعہ ''موت سے پہلے'' پہلی بار دسمبر 1945ء میں دہلی پرنٹنگ ورکس دہلی نے چھاپا۔ کتاب پر مصنف کا نام درج نہیں ہے۔ آگے چل کر لوگوں نے جان لیا اور مان لیا کہ یہ احمد علی کی تحریر ہے۔ اس میں قید خانہ کے نام سے ایک طویل افسانہ ہے۔ جو صفحہ ۴۶ ر پر ختم ہوتا ہے۔ بیشتر کتابوں میں مصنف کا پیش لفظ کتاب کی شروعات میں رہتا ہے۔ اپنی کتاب ''موت سے پہلے'' میں مصنف نے دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے جسے الٹی چال کہہ سکتے ہیں۔ (فوجیوں کو آگے کی جانب پھر پیچھے کی جانب دوڑنے کی پریکٹس کرائی جاتی ہے، ایکاؤنٹینٹ کو الٹی گنتی میں بھی مہارت ہوتی ہے۔ سو، ننانوے، اٹھانوے، ستانوے،......)۔ اس کتاب میں پیش لفظ نہیں بلکہ پس لفظ کے طور پر '' آرٹ سیاست اور زندگی'' کے عنوان سے ایک مضمون ہے۔ صفحہ ۴۷ ر سے شروع ہونے والا یہ مضمون طویل ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی لائبریری الہ آباد میں صفحہ ۶۷ ر تک موجود ہے۔ اس کے بعد کے اوراق غائب ہیں۔ طرز تحریر بتلاتا ہے کہ دس پندرہ



CS CamScanner



صفحات اور ہوں گے۔ بعد کے چند محققین نے پورے مضمون کو شائع کیا ہے۔ جو بھی ہو، یہ کوئی فکشن نہیں بلکہ ادب کے اصول یعنی Theory of Literature سے تعلق رکھنے والا مضمون ہے۔ مجھ ناچیز کے خیال میں یہ الوداعی تحریر ہے۔ اس مضمون کے بعد احمد علی کی قابل ذکر تحریر اُردو زبان میں نہیں ہے اور وہ تمام وکمال انگریزی زبان سے وابستہ ہوگئے۔ غالب، میر تقی میر، خواجہ میر درد کے علاوہ اُردو شاعری اور اُردو غزل پر کئی تنقیدی مضامین لکھے جو انگریزی زبان میں ہیں۔ اُردو شاعری اور اسلامیات سے متعلق انگریزی زبان میں احمد علی کی کئی کتابیں ہیں۔

The Falcon and the Hunted Bird : KITAB PUBLISHERS KARACHI, 1950

THE BULBUL AND THE ROSE : MAKTABA JAMIA KARACHI, 1960

AL-QURAN:CONTEMPORARY ENGLISH TRANSLATION, PRINCETON UNIVERSITY PRESS NEW JERSEY. 1988, 1994, 2001

AKRASH PUBLISHING KARACHI, 1984

THE GOLDEN TRADITION : COLAMBIA UNIVERSITY PRESS NEW YORK, 1973

GHALIB SELECTED POEMS : ISTITUTO ITALIANO PER IL MEDIO ED ESTREMO ORIENTE, 1969, ROMA

- GHALIB - TWO ESSAYS : ISTITUTO ITALIANO PER IL MEDIO ED ESTREMO ORIENTE, 1969, ROMA

THE PROBLEM OF STYLE AND TECHNIC OF GHALIB: AKRASH PUBLISHING KARACHI, 1969

THE FLAMING EARTH : FRIENDS OF INDONESIAN CULTURAL SOCIETY, 1949, KARACHI

PURPLE GOLD MOUNTAIN : KEEPSAKE PRESS LONDON, 1960

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اُردو کے کئی نامور ادیبوں نے اُردو کو چھوڑ کر دوسری زبان کا سہارا لیا۔ بھارتندو ہرشچندر، پریم چند، سدرشن، دیوندر ستیارتھی، راہی معصوم رضا، آشا پربھات، خوشونت سنگھ، رامانند

ISSN : 2582 - 3612

ساگر، کلدیپ نیئر، امرتا پریتم، شنکر شیلندر، اوپندر ناتھ اشک، کیول دھیر اور ان جیسے کئی ادیب ہیں جنھوں نے اُردو کو خیر باد کہا، جن کی یاد ہمارے دلوں کو تڑپاتی ہے۔ احمد علی بھی ایسا ہی اہم اور بھولا بسرا نام ہے۔

**Dr. Sufia Fatimee**
Asst. Professor
Department of Urdu
M. R. M. College
Darbhanga (Bihar)
Mob.- 77630 51364



CamScanner



ڈاکٹر عبدالواحد

# اسلوب احمد انصاری کی تنقید نگاری

اسلوب احمد انصاری ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے پوری زندگی انگریزی زبان وادب کی تدریس میں صرف کردی۔ ساتھ ہی ساتھ اردو زبان وادب کی بھی بے انتہا خدمت کی۔ ان کے اندر صداقت پائی جاتی تھی۔ ان کا روحانی پہلو مضبوط تھا۔ ان کے اندر جمالیاتی احساس اعلیٰ سطح پر تھا۔ انھوں نے اسلامی نظریات واعتقادات سے خوب استفادہ کیا۔ ان کی تحریر وشخصیت میں اسلامی عناصر کی کارفرمائی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ ان کی زندگی میں رنگارنگی نہیں تھی۔ زندگی اور تحریر میں شفافیت اور صداقت کا رنگ ہمیشہ رہا ہے۔

اسلوب احمد انصاری کو لکھنے پڑھنے کا شوق اسکول سے ہی تھا۔ انھوں نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کی ایک ساتھ خدمت کی ہے۔ ان کو اردو سے بے انتہا محبت تھی۔ والہانہ لگاؤ تھا۔ عشق کی حد تک ان کے جذبات اردو سے جڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ذوق وشوق کی بنا پر ہی اردو ادب سے وابستہ رہے۔ انھوں نے اپنی ذاتی مالیت سے اردو کی غیر معمولی خدمت کی ہے۔ ان کی تحریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا خاصہ ادبی تخلیقات کی تفہیم وتشریح اور ان کا تجزیہ کرنا ہے۔ انھوں نے اپنی فہم وفراست کو اولین ترجیح دی اور بے باکی سے اپنے خیالات ونظریات کو سامنے لانے کی کوشش کی، جس میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

اسلوب احمد انصاری کا پہلا مضمون پندرہ سال کی عمر میں چھپا۔ یہ مضمون اقبال پر تھا جو کہ کافی طویل تھا۔ انھوں نے اقبال اور غالب کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ انھوں نے شیکسپیئر اور ولیم بلیک کو بھی خاص اہمیت دی ہے۔ وہ اکثر وبیشتر جگہ انگریزی زبان وادب کو اردو زبان وادب پر فوقیت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اسلوب احمد انصاری کی اردو تصانیف کی تعداد انیس ہے۔ ان میں سے 'آئینہ خانے میں' کے علاوہ تمام کتابیں تنقید وتجزیہ اور تبصرہ پر مشتمل ہے۔ نیز کوئی بھی کتاب کسی ایک فن پر نہیں ہے، بلکہ تمام تصانیف مضامین کے مجموعے کی شکل میں ہیں۔ ان کی تصانیف میں 'ادب اور تنقید'، نقش غالب، اقبال کی تیرہ

نظمیں، نذر منظور، اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں، اطراف رشید احمد صدیقی، نقش ہائے رنگا رنگ، اقبال: حرف و معنی، غزل تنقید، اردو کے پندرہ ناول، تنقیدی تبصرے، آئینہ خانے میں، غالب: جدید تنقیدی تناظرات، حرفے چند، اقبال: جدید تنقیدی تناظرات، اندازے، نقش اقبال اور بازیافت' ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر تصانیف و مضامین اقبال و غالب کی شاعری اور ان کی شخصیات پر مشتمل ہیں۔

اسلوب احمد انصاری نے اقبال کو غالب پر فوقیت دی ہے۔ اس کے کئی محرکات و اسباب رہے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اقبال پر لکھی گئی تحریریں افراط و تفریط سے پاک نہیں ہیں، بلکہ ان میں بہت سی کمیاں اور کوتاہیاں رہ گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس پر خاص توجہ صرف کی ہے۔ اقبال کے افکار و خیالات اور ان کے فکری و فنی زاویے کی تفہیم، انھوں نے تاریخی پس منظر، فلسفۂ حیات، سیاسی و سماجی اور قرآنی زاویۂ نظر سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کو اقبال سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا، بلکہ عشق تھا۔ تاہم ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ کافی حد تک توازن کو برقرار رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن کہیں کہیں عشق کا پردہ فاش ہوتا ہوا بھی نظر آتا ہے اور جانب داری صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اقبال نے ایمان و اعتقاد کو بیساکھی کے طور پر نہیں استعمال کیا بلکہ اس میں ان کی پوری شخصیت ڈوبی ہوئی تھی اور وہ اس سے قوت و نمو حاصل کیا کرتے تھے۔ اسی کی مدد سے وہ اپنے کلام میں عشق، اثبات خودی، حرکت و عمل اور محنت شاقہ کا تصور، فقر و غنا، وجود انسانی کی روحانی اساس، مشینی نظام کے خلاف احتجاج اور فرد و جماعت کے درمیان توازن و ہم آہنگی قائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فقر کو ان کی شاعری میں بنیادی حیثیت حاصل ہے جو کہ تصوف کا اہم حصہ ہے۔ انھوں نے فقر کے سرے کو عشق سے جوڑ کر عشق اور خودی کے تصورات کو باہم پیوست کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسلوب احمد انصاری نے نہ صرف اقبال کی شاعری کا نت نئے طریقے سے مطالعہ کیا ہے بلکہ ان پر لکھی گئی تحریروں کا محاکمہ بھی کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اقبال پر لکھی گئی تحریریں اکثر و بیشتر افراط و تفریط کا شکار ہیں، جس میں تنازعات و تعصّبات کی کثرت ہے۔ ان میں اقبال کی اہمیت و افادیت کو غالب کے مقابلے میں گھٹانے کی کوشش کی گئی ہے، جہاں غالب کی شاعری کے اقدار کو ذاتی انکشافات سے تعبیر کیا گیا ہے جب کہ اقبال کی شاعری کو اسلامی نظریات و عقائد سے مستعار گردانا گیا ہے۔ اسلوب احمد انصاری کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اقبال کو غالب پر فوقیت دینے کی کوشش کی ہے بلکہ اردو کے تمام شعرا پر ان کو فوقیت دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن انھوں نے کلی طور پر اقبال کو غالب پر ترجیح نہیں دی، بلکہ اقبال و غالب پر کیے گئے مطالعے پر بھی بحث کی ہے اور بعض خاص جگہوں پر نشان دہی کی ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلوب احمد انصاری نے اقبال کی شاعری کا مطالعہ نہ صرف تجزیاتی اور تنقیدی طور پر کیا ہے بلکہ انھوں نے

R.N.I. : BIH URD/2019/78036

CamScanner



اقبال سے متعلق بعض غلط فہمیوں اور غیر مناسب نظریات کا ازالہ بھی کیا ہے۔ ان کی تنقید میں اقبال کی ہمہ جہت شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔

اسلوب احمد انصاری کی تحریریں عام طور پر غیر جانب دار ہیں، لیکن اقبال کے تعلق سے ان کے جذبات کبھی کبھی قابو میں نہیں رہتے، کئی جگہوں پر وہ اقبال سے والہانہ لگاؤ کو پوشیدہ نہیں رکھ پاتے۔ ان کا ماننا ہے کہ اقبال کی شعری کائنات کے سرچشمے قرآن، حدیث، فارسی صوفی شعرا، اسلامی اور مغربی مفکرین، قدیم و جدید فلسفہ اور سائنس ہیں۔

اسلوب احمد انصاری کے پسندیدہ موضوعات میں سے غالب کی شاعری کا تجزیہ و تبصرہ اور ان کی شخصیت پر لکھنا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ غالب کی شاعری میں فکر کی بنیادی اہمیت ہے جس میں شراب اور پیالے کا خاص تعلق ہے۔ یہ شراب ذہن و خیال سے انڈیلی جاتی ہے اور وہ خارجی پیکر میں انسان کے سامنے نمایاں ہوتی ہے۔ ان کے یہاں ''وحدت ثلاثہ'' میں 'شراب، پیالہ اور ساقی' ہیں۔ ان کی شاعری میں غم و اندوہ کا عرفان ہے جسے ان کو پسندیدہ بنانے میں دل چسپی بھی ہے۔ غالب کا کمال ہے کہ انھوں نے غم و کلفت میں خوبی کا پہلو نکالنے کو اصل تہذیب و اخلاق گردانا ہے۔ اگرچہ یہ کام ہر کس و ناکس کا نہیں کہ دل میں 'غم و کلفت' کے کانٹے چبھے ہوں اور طبیعت 'مہ و پروین' کا شکار کھیلنے کا اردہ رکھتی ہو۔ اس کے باجود ان کے یہاں بلند ہمتی اور عقابی نگاہ کا اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے غم ناک موضوعات کو شعری فن میں اس طرح مدغم کر دیا ہے کہ اس سے ایک خاص قسم کی خوبصورتی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسلوب احمد انصاری کا ماننا ہے کہ غالب کی شعریات میں رواں اور خرد یعنی فیضان اور قوت فیصلہ بنیادی اجزا ہیں، ان کے درمیان توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے سے شاعری کا وجود ہوتا ہے۔ حزنیہ جذبات و احساسات کو فنی آئینہ میں اتار کر پیش کرنے سے، ان کی کثافت دور ہو جاتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ غالب کی شاعری میں استعارے کا تفاعل نہ محض معنی و مفہوم کی توضیح کے لیے ہے، اور نہ تزئین و آرائش بیان کے لیے کہ یہ ان کی فطانت سے پورے طور پر میل نہیں کھاتا۔ بلکہ خیال کو بہ حد کمال وسعت دینے اور اس کے گوناگوں پہلوؤں کو سامنے لانے کے لیے ہے۔

اسلوب احمد انصاری نے غالب کو توانا، متجسس، بیدار ذہن، غور و تامل کرنے والا، تعقلی اور استدلالی بیان کا شہسوار شاعر گردانا ہے۔ غالب حقائق کے اندرون میں غوطہ زنی کر کے اسے از سر نو دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ان کی ادراکی قوت میں حسی تجربے کو غیر معمولی دخل ہے۔ ان کے یہاں عام طور پر کثیر العناصر اور کثیر الجہتی خیالات جنم لیے ہوئے نظر آ جاتے ہیں۔ ان کی شاعری تفتیش اور تفحص کی شاعری ہے۔ انھوں نے 'آتش، شراب، شعلہ، گل، گلشن، سیماب، موئے، آشیاں' فرہاد، تیشہ، کوہ کن، جیسے الفاظ کو مرکزی علائم کے طور پر استعمال کیا ہے۔ انھوں نے حقائق کی تلاش و جستجو کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ

ISSN : 2582 - 3612

حقیقت کی صحیح معرفت اس کے متضادات سے ہوتی ہے۔اس کے لیے عام طور پر استبعادی تکنیک کا سہارا لیا جاتا ہے۔ان کی شاعری کو عشق کی شاعری کے ساتھ جدید ذہن اور حسیت کی شاعری کے طور پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

اسلوب احمد انصاری نے غالب کا حالی اور عبدالرحمٰن بجنوری کی تحریروں کے ضمن میں بھی محاکمہ کیا ہے۔انھوں نے غالب کا مطالعہ نہ صرف ان کے شعری اور نثری کارناموں کے پس منظر میں کیا ہے بلکہ ان کا تقابلی مطالعہ ان کے ہم پلہ اردو اور انگریزی شاعروں کے پس منظر میں بھی کیا ہے، ساتھ ہی ان پر کی گئی تنقیدی تحریروں کا بھی تقابلی مطالعہ کیا ہے۔

اسلوب احمد انصاری کا یہ بھی خیال ہے کہ اقبال اور غالب مرکزی اقدار حیات کے اختلاف کے باوجود اہم شعری اظہار میں دونوں ایک دوسرے سے کافی مماثل نظر آتے ہیں۔البتہ غالب کی شہرت کا باعث اردو شاعری کے مزاج میں فکری عناصر کو شامل کرنا، شعری طرز گفتار کی کیمیاوی ترکیب جس کا تجزیہ و تحلیل مشکل ہے، اور انسانی تجربات کی تنوع و مختلف صورتوں کا بیان ہے۔ان دونوں میں ایک اور بنیادی فرق ہے کہ اقبال کی شاعری کے خیالات وافکار اور اس کے سرچشمے قرآنی تعلیمات، قدیم وجدید فلسفہ، صوفی شعرا، اسلامی و مغربی مفکرین کے خیالات ہیں جب کہ غالب کی شاعری ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے البتہ ان کے یہاں بوعلی سینا، غزالی، رومی، جامی وغیرہ کے نظریات وخیالات اور اس کے فلسفے وراثتاً آئے ہیں۔اقبال کے یہاں عقاب وشاہین بار بار نظر آجاتے ہیں اسی طرح غالب کے یہاں طاؤس جا بجا نظر آتا ہے۔

اسلوب احمد انصاری نے اقبال و غالب کا نہ صرف موازنہ کیا ہے بلکہ ان دونوں شخصیتوں کی زندگی اور شاعری کا بالاستعاب مطالعہ کیا ہے اور ان کی باریکیوں کو سمجھا ہے۔انھوں نے اقبال کو غالب سے مربوط کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے جگہ جگہ پر انگریزی شاعروں سے اقبال کا تقابل و موازنہ کیا ہے۔

اسلوب احمد انصاری نے اقبال و غالب کے علاوہ کئی دیگر شعرا کی زندگی اور ان کی شاعری پر تفصیلی اور اجمالی جائزہ لیا ہے۔ان میں ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، میر درد، میر تقی میر، جرأت، مومن، داغ دہلوی، میر مہدی، مجروح، ابن انشا، امیر مینائی، حسرت موہانی، فراق گورکھپوری، مجاز، شاذ تمکنت، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، فیض احمد فیض، ناصر کاظمی، اختر الایمان، منیر نیازی اور شکیب جلالی ہیں۔ان میں سے بعض شعرا پر دو دو تین تین مضامین ملتے ہیں اور بعض پر صرف ایک ایک مضمون ہی ملتا ہے۔انھوں نے حسرت کی شاعری میں میر تقی میر اور مومن کے رنگ کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے اور بتایا ہے کہ حسرت نے ان دونوں کے رنگ کو ضرور اپنایا ہے لیکن اپنے مزاج میں سمو کر ایک نیا آہنگ و فضا تیار کی ہے۔ان کو تصوف سے آشنائی تھی یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں حقیقت و مجاز کے درمیان امتزاج ہے۔واردات قلبی کے بیان پر ان کو


CamScanner



قدرت حاصل ہے۔مثالی محبوب کی خوبصورت مرقع کشی کرنے کا ہنر ان کو آتا ہے۔البتہ ان کی شاعری میں حسن و عشق سے تجاوز کر کے دل و دماغ میں سما جانے کی صلاحیت نہیں ہے۔اسلوب احمد انصاری نے حسرت کو اردو تاریخ کے شعرا میں دوسرے درجے کے شاعروں میں شمار کیا ہے۔انھوں نے حسرت کی شاعری کو، ان کی نثری تحریروں کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے اور اس نتیجہ پر وہ پہنچے ہیں کہ حسرت شاعری سے متعلق جن اصولوں کے قائل ہیں، وہ خود ان کی پابندی شاعری میں کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

اسی طرح اسلوب احمد انصاری نے فراق کی شاعری کے شروعاتی دور کو مومن، مصحفی اور امیر مینائی کی شاعری کے رنگ سے جوڑا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ فراق نے میر تقی میر کے اثرات بھی کچھ حد تک قبول کیے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ فراق نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ڈن، ورڈز ورتھ اور سومیزن سے استفادہ کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے یہاں سوز و گداز اور تفکرات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ان کا ماننا ہے کہ فراق کے یہاں عشقیہ شاعری کا عنصر قدم قدم پر نظر آتا ہے، عشقیہ احساسات کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کا گہرا شعور بھی ملتا ہے جو ہمہ گیر کائنات اور اس کے پیچ در پیچ مسائل کے اردگرد گھومتے ہیں۔ان کی عشقیہ کیفیات میں عرفان کا احساس ہے، جس میں نئی زندگی اور جدید اقدار کے نقوش واضح طور پر نظر آتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ ان کی شاعری میں فضائی موسیقیت، نادر تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال جا بجا ملتے ہیں۔

اسلوب احمد انصاری کا تحریری منہج تنقیدی ہے۔زبان و بیان اور الفاظ و جملوں میں ان کی عملیت اور استدلالی انداز کھل کر سامنے آتا ہے۔انھوں نے اقبال کی شاعری اور ان کے نظریات وافکار کو ایک خاص زاویے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ان کا انداز کہیں جارحانہ ہے تو کہیں میانہ۔لیکن ان میں ایک بات جو کہ مشترک معلوم ہوتی ہے، وہ غیر جانب داری ہے۔البتہ اقبال شناسی کے زمزرے والی تحریر میں قدرے جذباتیت اور جانب داری کا احساس ضرور ہوتا ہے۔

اسلوب احمد انصاری کی تحریروں میں علمیت، منطقیت، استدلالیت اور معروضیت ہے۔ان کی تحریروں میں مشکل لفظیات کا استعمال اور انگریزی اصطلاحات و الفاظ جگہ جگہ ملتے ہیں۔عموماً اردو کی جگہ انگریزی کی اصطلاح نظر آتی ہے جہاں اردو کا کوئی بہتر لفظ نہیں ہوتا، وہاں پر انگریزی لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔غزلوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اسلوب احمد انصاری عام طور پر شاعری کی فکری اور فنی خوبیوں اور خامیوں کی وضاحت کرتے ہیں اور پھر ایک ایک شعر کی تشریح و تعبیر اور اس کی جہت فکر و فن کا تعین کرتے ہیں۔ان کا خاصہ یہ ہے کہ وہ شعر کی تشریح و تفہیم سے زیادہ اس کی فنی جہتوں سے بحث کرتے ہیں۔شعری تلازمات اور اس کے پس منظر کا ذکر وہ نہیں کرتے بلکہ اس کو وہ قاری کے فہم و ادراک پر چھوڑتے ہیں اور اپنی ذہنی سطح پر گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے عام قاری ان کی تحریر کو اول نظر میں مشکل اور گنجلک

ISSN : 2582 - 3612

محسوس کرتا ہے۔

ان کی تحریروں میں کہیں کہیں بظاہر تضادات کی سی صفت نظر آتی ہے لیکن ایسا اس لیے کہ فن پارے میں خوبیوں وخامی دونوں ہوتی ہے۔ اگر ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ کیا جائے تو متضاد باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن درحقیقت یہی حقیقت اور فن پارے کا حق ہے۔ اسلوب احمد انصاری کبھی کبھی پہلے صفحے پر شاعر کی شاعری یا ان کی تخلیقات کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں تو دوسرے صفحات پر ان کی خامیوں کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ جس مقدار میں فن پارے کی خوبیاں نظر آئیں، ان کا ذکر اسی کمیت و کیفیت کے ساتھ کیا ہے اور جس قدر خامیاں رہیں ان کا بھی معاً ذکر کیا ہے۔

اسلوب احمد انصاری کی تحریروں میں استدلالی اور عملی تنقید کے نمونے کثرت سے ملتے ہیں۔ بہت کم ایسا دیکھا گیا ہے کہ انھوں نے عمومی طور پر گفتگو کی ہو اور ہوا میں تیر چلانے کی کوشش کی ہو۔ انھوں نے اپنی تحریر کو متن کے ارد گرد رکھنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں کہیں پر اختصار تو کہیں پر تفصیل ہے، معلوم ہوتا ہے کہ حالات وتقاضے کے اعتبار سے انھوں نے اختصار و طوالت کا منہج اپنایا ہے۔ انھوں نے تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے فن پاروں کے معیارات بھی طے کیے ہیں اور متعدد فن پاروں کے درمیان امتیازات وافتراقات کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ عام طور پر کسی بھی مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے طویل تمہیدی گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، جس سے مسئلہ کی باریکی اور اس کی تہہ داری کی تفہیم قاری کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔

زبان وبیان کے نقطۂ نظر سے اسلوب احمد انصاری کی تحریر دیگر تنقید نگاروں سے خاصی الگ معلوم ہوتی ہے۔ ان کے یہاں اردو لفظیات میں انگریزی وعربی الفاظ کا کثرت سے استعمال ملتا ہے۔ ان کی عبارت میں ٹھوس پن ہے۔ ان کے جملے طویل ہوتے ہیں۔ کئی جگہوں پر تین تین چار چار سطور تک ایک ایک جملہ ہوتا ہے۔ تاہم سکتہ کا استعمام بھی بیچ بیچ میں ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں گونا گوں خوبیاں پائی جاتی ہیں، جن سے ان کے عملی وادبی وقار ومعیار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسلوب احمد انصاری کی زبان عموماً علمی اور استدلالی ہے لیکن کہیں کہیں ایسے الفاظ وتراکیب کا استعمال ملتا ہے جن کو خوب صورت انشا پردازی کی زبان کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے، ان میں زبان وبیان کی لطافت بھرپور ہوتی ہے۔ شاعری اور فکشن تنقید دونوں میں اس طرح کی زبان میں یکسانیت پائی جاتی ہے، جس میں جملوں کی ساخت وہیئت اور مفہوم کی ادائیگی شامل ہے۔ بعض جگہوں پر اسلامی اور تصوفانہ وعارفانہ لفظیات کا خوب صورتی کے ساتھ استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ جب وہ مختلف تحریروں کا تقابل کرتے ہیں تو متنوع زبان وبیان اور متنوع علوم وفنون سے واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

R.N.I. : BIH URD/2019/78036

CS CamScanner



مجموعی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو ادب کے حوالے سے اسلوب احمد انصاری کی خدمات بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کی بے لوث خدمت کی ہے۔ ان کی تحریروں میں معروضیت، قطعیت اور فن پاروں کو معیار عطا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

## مآخذ ومراجع


| مصنف/مرتب | نام کتاب | ناشر/مطبع، سن اشاعت |
| --- | --- | --- |
| انصاری، اسلوب احمد | نقش اقبال | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۰۱۲ |
| انصاری، اسلوب احمد | غالب: جدید تنقیدی تناظرات | غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۲۰۰۴ |
| انصاری، اسلوب احمد | نقش ہائے رنگ رنگ | غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۹۸ |
| انصاری، اسلوب احمد | اقبال: جدید تنقیدی تناظرات | یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۰۵ |
| انصاری، اسلوب احمد | نقش غالب | غالب اکیڈمی، نئی دہلی ۱۹۷۰ |
| انصاری، اسلوب احمد | ادب اور تنقید | سنگم پبلیشر، الہ آباد ۳، ۱۹۶۸ |
| انصاری، اسلوب احمد | مطالعۂ اقبال کے چند پہلو | بشیر پرنٹرز، لاہور ۱۹۸۶ |
| انصاری، اسلوب احمد | اقبال کی تیرہ نظمیں | زرین آرٹ پریس، لاہور ۱۹۷۷ |
| انصاری، اسلوب احمد | غزل تنقید | یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۰۲ |
| انصاری، اسلوب احمد | اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں | غالب اکیڈمی، نئی دہلی ۱۹۹۴ |
| انصاری، اسلوب احمد | اقبال: حرف ومعنی | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۸ |


**Dr. Abdul Wahid**
Assistan Professor
Government Maharani Laxmibai
Girls PG College
Kila Maidan, Indore
Madhya Pradesh
Mob.- 93549 45726

ISSN : 2582 - 3612

ڈاکٹر رفعت عالیہ

# مولانا ابوالکلام آزاد: معمار ادب وصحافت وسیاست

مولانا ابوالکلام آزاد کا اصل نام محی الدین احمد جب کہ تاریخی نام فیروز بخت تھا۔آپ کی کنیت ابوالکلام اور تخلص آزاد تھا۔اسی کنیت اور تخلص سے آپ زیادہ مشہور ومعروف ہوئے۔آپ کے والد گرامی کا نام محمد خیرالدین اور والدہ محترمہ کا نام عالیہ بنت محمد تھا۔آپ کی ولادت جزیرۃ العرب کے مشہور ومعروف ومقدس شہر مکۃ المکرّمہ میں 11 نومبر 1888 بمطابق 1305 ذوالحجہ میں ہوئی۔آپ کے والد نے آپ کی پیدائش کے تقریباً دوسال بعد ملک ہندوستان کی طرف ہجرت کی اور یہاں شہر کلکتہ میں سکونت اختیار کی۔آپ کا مادری وطن عرب ہونے ساتھ آپ کی مادری زبان عربی تھی۔آپ کا سلسلہ نسب مشہور ومعروف اسلامی تاریخ کے فلاسفر شیخ جمال الدین افغانی سے ملتا ہے۔آپ کی ابتدائی تعلیم وتربیت آپ کے اپنے ہی دینی واخلاقی گھر میں اپنے شفیق والد بزرگوار کے پاس ہوئی،جس نے آپ کی تعلم وتربیت میں اپنا خاص کردار ادا کیا۔ان کے علاوہ آپ نے مولوی ابراہیم،مولوی محمد عمراور مولوی سعادت حسن سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد آپ جامعہ الازہر مصر چلے گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی سماجی خدمات:

مولانا ابوالکلام آزاد مسلمانوں کے لئے تعمیری سوچ وفکر رکھنے والے جید عالم دین، مصلح،محقق، مصنف،مقرر وبے باک خطیب تھے۔آپ اپنی قوم کو تہذیب وتمدن اور ثقافت کے علاوہ موجودہ وقت کے حالات کے متعلق روشناس کرانے والے مؤرخ تھے۔مولانا آزاد ایک ایسی بصیرت افروز شخصیت کا نام تھا جو کسی تعارف کا محتاج نہیں۔آپ کی شخصیت زندگی کے مختلف پہلوؤں پر محیط تھی اور جس کا کوئی بھی پہلو پوشیدہ نہیں تھا۔آپ تخلیقی صلاحیت کے حامل کار شخصیت تھے۔آپ بیک وقت عالم دین،سیرت نگار،مفسر،محقق، ادیب،مفکر، فلاسفر،مصنف،صحافی،شیرین بیان خطیب،آزادی ہند کے نڈر مجاہد اور عظیم قائد کے علاوہ سیاست کے بے مثال مایہ ناز ماہر سیاست دان تھے۔الغرض آپ اپن وقت کے ہر فن میں ماہر تھے۔آپ نے تقریباً زندگی کے ہر میدان میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔خواہ وہ تقریر وخطابت ہو یا تصنیف وتالیف، شعر گوئی ہو یا نثر نویسی،سیاسی میدان ہو یا علمی میدان آپ نے مصنف کا پیشہ اختیار کیا اور اردو زبان کو اپنی

R.N.I. : BIH URD/2019/78036

CamScanner



پیشہ وارانہ زبان بنادی۔

آپ نے کم عمری سے ہی لکھنا شروع کیا۔آپ نے سنہ 1900 میں محض باہ سال کی عمر میں پہلی بار ماہنامہ ''نیرنگ عالم'' جاری کیا،اور موسی نامی ایک شخص کے ہفت روزہ اخبار ''المصباح'' کی ادارت بھی کرنے لگے۔1903 میں انہوں نے ماہنامہ رسالہ ''لسان الصدق'' شائع کیا،جس کے مالک ومدیر وہ خود تھے۔اسی دور میں معروف رسالے ''خدنگ نظر'' کے ادبی حصہ کے ایڈیٹر بھی رہے۔جب آزاد نے ''لسان الصدق'' شائع کیا اس وقت ان کی عمر محض 15 سال کی تھی۔اس رسالے کا مقصد اصلاح معاشرہ،سماج کی ترقی اور ذوق علم تھا۔سنہ 1912 میں اردو ہفتہ وار ''الہلال'' جاری کیا جو انگریز مخالف اور حب الوطنی پر مبنی مواد کے لئے کافی مقبول ہوا لیکن حکومت نے اس پر 1914 میں پابندی عائد کردی۔اس کے بعد مولانا آزاد نے ''البلاغ'' کے نام سے دوسرا اخبار نکالنا شروع کردیا۔جس میں علم وادب،تاریخ ومذہب،سماجیات ومعاشرت کے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔

مولانا کا خواب تھا کہ ملک ہندوستان کو سائنسی اور فنی دنیا میں اپنا ایک منفرد مقام حاصل ہو،جس کیلئے آپ نے کئی اہم اور ٹھوس قدم اٹھائے تاکہ اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا جائے۔اسی لئے آپ نے کئی اہم اداروں کا قیام عمل میں لایا،جن میں یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (UGC)،سنٹرل کونسل فار انڈسٹریل رسرچ (CCIR)،انڈین کونسل فار سائنس ریسرچ (ICSR)،انڈین کونسل فار میڈیکل ریسرچ (ICMR)،وغیرہ شامل ہیں۔اسی طرح انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کی توسیع وترقی عمل میں لائی۔ نیشنل کونسل فار ٹیکنیکل ایجوکیشن کے توسط سے تکنیکی تعلیم کو کافی وسعت دی،جس سے ملک کے اندر روزگار کے اور زیادہ مواقع فراہم ہوپائے۔آپ نے سنہ 1951 میں ایک اور ایسا کارہائے نمایاں انجام دیا،جب آپ نے فنی تعلیم وتربیت کے لئے کھڑگپور انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹیکنالوجی کا قیام عمل میں لایا۔آپ نے اپنی آخری سانس تک ملک کی اعلی اور فنی تعلیم کے لئے بے مثال جدوجہد کی ہے۔الغرض مولانا نے جدید ہندوستان کی تعمیر وترقی میں اپنا ایک اہم اور خاص کردار ادا کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی خدمات:

مولانا نے تحریک آزادی ہند میں بڑے ہی جوش وجذبہ اور شوق سے حصہ لینا شروع کیا۔آپ تحریک آزادی ہند کے ہیرو ہی نہیں بلکہ انگریزوں کے خلاف لڑنے والے صف اول کے سپہ سالار تھے۔آپ تحریک آزادی کے اہم ستون مانے جاتے تھے۔آپ کے اندر حب الوطنی کا جذبہ بے مثال تھا۔آپ قلیل وقت میں سرگرم کارکن کے طور پر ابھر کر سامنے آئے ہیں۔سنہ 1912 میں آپ نے مشہور رسالہ ''الہلال'' نکالنا شروع کیا،جس سے سیاسی میدان میں کافی تیزی دیکھنے کو ملی۔یہی وجہ تھی کہ برطانوی حکومت نے

ISSN : 2582 - 3612

1914 میں پریس ایکٹ کے تحت اس کی اشاعت پر پابندی عائد کردی تھی۔ مولانا کا سیاسی سفر یہیں نہیں رکا بلکہ آپ نے اس کے فوراً بعد ''البلاغ'' نکالنا شروع کیا۔ اسی طرح سے آپ نے قومی، سیاسی، مذہبی اور سماجی اصلاحات کو قوت بخشی۔ جب پورے ملک میں آپ کی مقبولیت میں اضافہ دیکھنے کو ملا تو برطانوی حکومت کی طرف سے آپ کو جیل میں ڈال دیا گیا، جس کے بعد آپ کو کئی سال تک قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ ان تمام حالات کے باوجود آپ کبھی دلبرداشتہ نہیں ہوئے۔ آپ نے ہمیشہ قوم کو ملک کی سالمیت اور آپسی اتحاد و بھائی چارگی کو برقرار رکھنے پر زور دے کر اسے کامیابی کا راز ٹھہرایا ہے۔

آپ کو تحریک خلافت اور سول نافرمانی (CIVIL DISOEDIENCE) کے بنیادی ممبران میں شمار کیا جاتا ہے۔ آپ نے مہاتما گاندھی جی کی نگرانی میں تحریک عدم اعتماد میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سنہ 1940 میں آپ کانگریس پارٹی کے صدر منتخب ہوئے تو آپ نے دوٹوک الفاظ میں محمد علی جناح کے دوقومی نظریے (TWO NATION THEORY) کی سخت مخالفت کی۔ آپ نے مذہبی تفریق کے خلاف زوردار آواز اٹھائی اور مسلمانوں کو دشمن عناصر قوتوں سے ہوشیار رہنے کی مؤثر اپیل کی۔ آپ نے تادم حیات ہندو مسلم یکجہتی کے عقیدے کو من وعن قائم رکھا۔ آپ کا قول ''مجھے ہندوستانی ہونے پر فخر ہے'' اس بات کی خوب عکاسی کرتا ہے۔

ملک ہندوستان کو 1947 میں آزادی حاصل ہونے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد پہلے وزیر تعلیم بنے۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے آپ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ تاریخ کے اوراق میں سنہرے حروف میں درج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک آج آپ کی یوم پیدائش کو قومی یوم تعلیم کے طور پر مناتی ہے۔ بھارت کو آزادی حاصل ہونے کے بعد آپ نے شہرہ آفاق کتاب ''india wins freedom'' کے نام سے لکھ ڈالی، جو آپ کی فکری جد وجہد آزادی، علمی و فہمی بصیرت، سیاسی و سماجی بلوغیت، تدبر قومی سالمیت اور دیگر ایسے بے مثال کارناموں کو عیاں کرتی ہے جو نئی نسل کے لئے ہمیشہ ایک متاثر کن متحرک طاقت کے طور پر رہے گی۔

آج کے جدید ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے نام پر کئی اہم ادارے منسوب کئے گئے ہیں، جن میں مشہور و معروف جامعہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANOU) حیدرآباد، مولانا آزاد نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (MANIT) بھوپال، مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز (MAIAS) کلکتہ، مولانا آزاد میڈیکل کالج (MAMC) نئی دہلی، مولانا ابوالکلام آزاد عربک۔ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، راجستھان، مولانا ابوالکلام آزاد اسلامک اویکنگ سنٹر، نئی دہلی، مولانا آزاد نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ڈینٹل سائنسز، نئی دہلی جیسے اہم ادارے قابل ذکر ہیں۔

R.N.I. : BIH URD/2019/78036

CS CamScanner



مولانا آزاد قومی یکجہتی کے حامی:

سیاسی منظرنامے میں ابھرنے کے بعد آزاد نے قومی اتحاد کو آزادی کا سب سے اہم ہتھیار قرار دیا تھا۔ سنہ 1921 میں آگرہ میں اپنی ایک تقریر کے دوران انہوں نے الہلال کے بنیادی مقاصد کا ذکر کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ:

''میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرا پہلا مقصد ہندو مسلم اتحاد ہے۔ میں مسلمانوں سے یہ کہنا چاہوں گا کہ ان کا فرض ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ محبت اور بھائی چارے کا رشتہ قائم کریں تا کہ ہم ایک کامیاب قوم کی تعمیر کر سکیں۔''

مولانا آزاد کے لئے قوم کا اتحاد آزادی سے بھی زیادہ اہم تھا۔ سنہ 1923 میں کانگریس کے خصوصی اجلاس سے اپنے صدارتی خطاب میں انہوں نے کہا تھا کہ:

''آج بھی اگر کوئی دیوی آسمان سے اتر کر یہ کہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے بدلے 24 گھنٹے کے اندر اندر ہمیں آزادی دلائے گی تو میں اسے مسترد کردوں گا۔'' ان کا ماننا تھا کہ ''آزادی ملنے میں تاخیر سے ہمارا کچھ نقصان ضرور ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد ٹوٹ گیا تو پوری انسانیت کا نقصان ہوگا۔''

یہ وہ وقت تھا جب قومیت اور ثقافتی شناخت کو مذہب کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جا رہا تھا۔ ایسے میں مولانا آزاد ایک ایسی قوم کا تصور کر رہے تھے جہاں مذہب، ذات پات، فرقہ اور جنس کسی کے حقوق کی راہ میں رکاوٹ بن کر حائل نہیں ہوں گے۔ ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار مولانا آزاد کبھی مسلم لیگ کے دوقومی نظریے کے حامی نہیں بنے اور انہوں نے کھل کر اس کی مخالفت کی تھی۔

15 اپریل 1946 کو کانگریس کے صدر مولانا آزاد نے کہا کہ:

''میں نے پاکستان کی شکل میں مسلم لیگ کے الگ ملک کے مطالبے کو ہر زاویے سے دیکھا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ فیصلہ نہ صرف ہندوستان کیلئے نقصاندہ ثابت ہوگا بلکہ اس کا خمیازہ خود مسلمانوں کو بھی بھگتنا پڑے گا۔ کسی حل کے بجائے یہ فیصلہ مزید مسائل پیدا کرے گا۔''

مولانا آزاد نے تقسیم ہند کو روکنے کی ہر ممکن کوشش بھی کی تھی۔

سنہ 1946 میں جب تقسیم ہند کی نئی شکل کافی حد تک واضح ہونے لگی اور دونوں پارٹیاں تقسیم پر متفق بھی ہوگئیں تو مولانا آزاد نے سب کو خبردار کیا تھا کہ آنے والے وقت میں ہندوستان کو اس تقسیم کے نتائج بھگتنا ہوں گے۔

ISSN : 2582 - 3612

انہوں نے کہا تھا کہ نفرت کی بنیاد پر بننے والا یہ نیا ملک اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک یہ نفرت زندہ رہے گی، جب تقسیم کی یہ آگ ٹھنڈی ہونے لگے گی تو یہ نیا ملک بھی مختلف ٹکڑوں میں بٹنا شروع کردے گا۔

مولانا آزاد نے جو منظر سال 1946 میں دیکھا تھا وہ قیام پاکستان کے چند سال بعد ہی سنہ 1971 میں سچ ثابت ہوا۔انہوں نے پاکستان سے متعلق بہت سی پیشنگوئیاں کی تھیں۔

قیام پاکستان سے قبل ان کا کہنا تھا کہ یہ ملک متحد نہیں رہ سکے گا، سیاسی قیادت کے بجائے فوج کی حکومت ہوگی، یہ ملک بھاری قرضوں کے بوجھ تلے دب جائے گا اور اسے ہمسایہ ممالک سے جنگ کے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

انہوں نے متنبہ کیا تھا کہ پاکستان میں امیر تاجر قومی دولت کا استحصال کریں گے اور عالمی طاقتیں اس پر تسلط جمانے کی کوشش جاری رکھیں گی۔

اس طرح مولانا نے انڈیا میں رہنے والے مسلمانوں کو پاکستان ہجرت نہ کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔انہوں نے مسلمانوں کو سمجھایا تھا کہ ان کے سرحد پار کرنے سے پاکستان مضبوط نہیں ہوگا بلکہ انڈیا کے مسلمان کمزور ہوں گے۔

انہوں نے بتایا تھا کہ وہ وقت دور نہیں جب پاکستان میں پہلے مقیم لوگ اپنی علاقائی شناخت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے جبکہ انڈیا سے آنے والوں کو بن بلایا مہمان سمجھا جائے گا۔

مولانا آزاد نے مسلمانوں کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ ''اگرچہ مذہب کی بنیاد پر ہندو آپ سے مختلف ہیں لیکن وہ قوم اور حب الوطنی کی بنیاد پر مختلف نہیں ہیں۔دوسری طرف پاکستان میں آپ کو دوسری قوم کے شہری کے طور پر دیکھا جائے گا۔''

بالآخر آزاد ہندوستان کا یہ آزاد سچا سپوت 22 فروری 1958 کو دہلی میں اس دنیا سے رحلت کر گیا۔آپ دہلی کی جامع مسجد کے قریب مدفون ہیں۔الغرض آپ کی سیاسی، سماجی خدمات وقومی یکجہتی کا میدان وسیع تر ہے۔قوم ہمیشہ آپ کو یاد کرے گی اور ملک کو آپ پر ناز رہے گا۔

**Dr. Raffat Aaliya**
Asst. Prof. (Guest)
Department of Urdu
Ranchi Women's College
Ranchi (Jharkhand)
Mob.- 89877 26225



CamScanner



ڈاکٹر افسانہ پروین

# اردو زبان کی پیدائش سے متعلق ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی کا نظریہ

اردو زبان کی پیدائش سے متعلق جب ہم اہل علم اور ماہر لسانیات کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی کا آتا ہے۔انہوں نے اردو زبان کے آغاز وارتقا کے متعلق اپنے خیال کا اظہار کتاب "دکن میں اردو" ۱۹۲۳ء میں کیا۔

ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی اردو کے ابتدا سے متعلق رقمطراز ہیں:

''جب ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ بود وباش اختیار کرتی ہے تو یہ امر ناگزیر ہے کہ بول چال اور کام کاج میں ایک کے الفاظ دوسرے میں منتقل ہوں۔''

ہندوستان ہمیشہ غیر اقوام کی آماجگاہ رہا ہے۔آرین قوم نے شمالی ہند پر حملہ کیا اور یہاں کے قدیم باشندوں کو جنوب کی طرف ڈھکیل دیا، ان کی زبان تمل، اڑیا، اور تلگو وغیرہ تھی، چنانچہ آج تک دکن میں یہ قدیم باشندے مروج ہیں، فاتحوں نے خیال کیا کہ عام شودروں (مفتوح) کی زبان سے اپنی زبان بلند پایہ ہونی چاہیے چنانچہ انہوں نے قواعد واصول ترتیب دیئے اور اپنی زبان کا نام سنسکرت رکھا، لیکن ان کے سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے لوگوں: میں آکر کچھ اور ہوگئے اور ہوتے ہوتے پراکرت زبان خود بخود پیدا ہوگئی۔

آج سے پہلے پروفیسر دیبر کی تحقیقات کی رو سے چھٹی صدی عیسوی میں بیس سے زیادہ پراکرت زبانیں بولی جاتی تھیں، جن میں سے پانچ زیادہ مشہور تھیں، یعنی پالی، جینی، مہاراشٹری، شورسینی اور مگدھی۔

شورسینی کا دوسرا نام برج بھاشا ہے، یہ زبان بہت وسیع علاقہ میں بولی جاتی تھی۔سندھ سے بہار اور لاہور سے مالوہ تک اس کی وسعت تھی، اردو زبان کا مخزن اس برج بھاشا کو قرار دیا گیا تھا، مگر جدید تحقیقات کی رو سے یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔

اردو کی ابتدا کے متعلق اس وقت جو نظریے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(الف) اردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی

(ب) اردو کی ابتدا سندھ سے ہوئی

(ج) اردو کی ابتدا دکن سے ہوئی

(د) اردو کی ابتدا دوآبہ گنگا جمنا سے ہوئی

یہ امر تقریباً تصفیہ شدہ ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے:

''باہمی میل جول سے پیدا ہوئی، اس لیے جن اصحاب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی ابتدا سندھ اور دکن سے ہوئی یہ ایک حد تک غلط نہیں ہوسکتا، کیونکہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے انہیں مقامات پر ہوئی۔"1

(دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی)

مندرجہ بالا طویل اقتباسات سے جو باتیں اخذ ہوئیں وہ یہ ہیں کہ جب دو یا اس سے زیادہ قومیں ایک ساتھ ایک جگہ پر رہائش پذیر ہو جاتی ہیں تو ان میں سماجی، معاشرتی اور اخلاقی، بول چال، لین دین اور کام کاج، غرض کہ زندگی کے ہر خانے میں ایک دوسرے کی تہذیب اثر آمد ہوتی ہے۔

آگے ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں پر جب آریوں نے حملہ کیا اور ان کو ڈھکیلتے ہوئے جنوبی ہندوستان تک لے گئے تو فاتح قوم نے مفتوح قوم سے برتری حاصل رکھنے کے لئے اپنی زبان الگ تھلگ رکھی جسے سنسکرت کے نام سے پہچان ملی، لیکن یہ زبان خواص سے نکل جب عوام میں پہنچی تو ان کے تلفظ اور مخرج میں بگاڑ پیدا ہونا شروع ہوا اور ایک زمانہ ایسا آیا جب ایک نئی زبان پراکرت نے جنم لیا، پروفیسر دیبر کی تحقیقات کے مطابق چھٹی صدی عیسوی میں بیس سے زیادہ پراکرت زبانیں چلن میں تھیں، جن میں پالی شورسینی (برج بھاشا) اور ماگدھی جیسی مشہور زبانیں شامل تھیں، ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر اردو زبان مسلمان اور ہندوؤں کے باہمی میل جول کا نتیجہ ہے تو جن حضرات نے سندھ اور دکن کو اردو کے جائے پیدائش ہونے کا دعوی کیا ہے وہ ایک حد تک غلط نہیں ہوسکتے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ انہوں نے اردو کی جائے پیدائش سے متعلق دکن میں ہونے کا دعوی نہیں کیا جیسا کہ بعض ماہر لسانیات نے دعوی کے ساتھ الگ الگ جگہوں کو اردو کی جائے پیدائش سے متعلق کیا ہے، بلکہ اس کتاب میں آگے چل کر خود اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ اردو کی پیدائش دکن میں نہیں ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"سندھ کی اسلامی حکومت کا آغاز 712ء سے ہو چکا تھا، اور صدیوں تک وہ یہاں حکومت کرتے رہے، حکومت کی رواداری اور ہندو مسلمانوں کے عام طور سے ملنے جلنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنے اور باہمی تبادلۂ خیال کے



CS CamScanner



مواقع پیدا ہو گئے، ان حالات کے مدنظر اگر یہ دعوی کیا جائے کہ ہندو اور مسلمانوں کے امتزاج سے جو زبان بنی اس کا آغاز اس مقام سے ہوا ہے تو غلط نہیں ہوسکتا لیکن جو تحقیقات ہوئی ہے اس لحاظ سے جو زبان عالم وجود میں آئی وہ عربی اور شورسینی سے مشترک ہوتی مگر چونکہ اس میں فارسی کا حصہ زیادہ ہے، اس لئے ہم یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کی اردو کی ابتدا سندھ سے نہیں ہوئی، سندھ کے بعد مسلمانوں کی آمد سواحل مالا بار اور کرناٹک پر ہوئی۔''

جو دعویٰ اردو کے دکن سے پیدا ہونے کا کیا جاتا ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہوسکتا ہے مگر جو امور سندھ سے اردو کی ابتدا ہونے کے مانع ہیں وہی امور یہاں بھی مانع آتے ہیں، اس لیے ہم دکن کو بھی اردو کا مولد نہیں قرار دے سکتے۔

پنجاب کے مولد ہونے کے متعلق مؤلف '' پنجاب میں اردو مولانا محمود شیرانی نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، مگر جب تک مسعود کا ہندوی دیوان دستیاب نہ ہو ان کی تحقیقات کو صحیح نہیں کہا سکتا اور جیسا کہ سید محی الدین قادری زور کی رائے ہے کہ پنجابی زبان اردو کی ماں نہیں ہوسکتی، بلکہ بہن ہوسکتی ہے۔ سندھ، دکن اور پنجاب کے خارج ہو جانے کے بعد اب صرف دوآب گنگا جمنا باقی رہتا ہے جو اردو کے مولد ہونے کا مدعی ہوسکتا ہے۔

موجودہ زمانے کے ماہر لسانیات یعنی پروفیسر موسیو جولس بلاک، پروفیسر ٹرنر، پروفیسر بیلی، پروفیسر چٹر جی اور سید محی الدین قادری زور کی تحقیقات کی رو سے اردو کا سرچشمہ وہ زبان ہے جو پنجابی اور برج بھاشا دونوں کی ماں تھی (ہندوستانی لسانیات اور ہندوستانی خصوصیات) یعنی وہ پراکرت زبان جو مسلمانوں کے آمد کے وقت پیشاور سے لے کر الہ آباد تک بولی جاتی تھی۔

مسلمان فاتحین شمال کی جانب سے ہندوستان میں داخل ہوئے تو اول انہوں نے پنجاب میں قیام کیا مگر اس کے بعد دہلی کی جانب پیش قدمی کی مسلمانوں کے صدہا خاندان، جو ترک، مغل اور افغان تھے جن کی زبان عام طور سے زیادہ تر فارسی تھی، پنجاب سے لے کر دہلی تک آباد ہوئے، اس زمانے میں یہاں جدید ہند آریائی دور کی پراکرت زبان بولی جاتی تھی، اس دیسی زبان میں غیر ملکیوں کی زبان کی آمیزش ہونے لگی اور اس امتزاج سے اردو کی پیدائش ہوئی۔ شمال کے فاتحین نے جب ۵۸۸ھ ۱۱۲۹ء میں دہلی کی چوہان سلطنت فتح کر لی تو یہ نئی زبان بھی اپنے ساتھ لائے، اس سرزمین برج میں مسلمانوں کی لائی ہوئی زبان ابھی پختہ نہیں ہونے پائی اور اس پر برج کا زیادہ اثر نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں نے

ISSN : 2582 - 3612

جنوب کا رخ کیا۔

(دکن میں اردو، نصرالدین ہاشمی)

مندرجہ بالا طویل اقتباس سے ڈاکٹر نصرالدین ہاشمی کی کتاب ''دکن میں اردو" سے میں نے لی ہے، اس طویل اقتباس کو پیش کرنے کا خاص مقصد ان کے نظریے سے متعلق ایک بڑی غلط فہمی کو رفع کرنا ہے اور ان کے خیال کو واضح طور پر سامنے لانا ہے تا کہ آئندہ کسی غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ علمی و ادبی دنیا میں بھی ایسی غلط فہمیاں کس طرح پیدا ہو جاتی ہیں، اور نہ صرف یہ کہ پیدا ہو جاتی ہیں بلکہ اس حد تک مشہور ہو جاتی ہیں کہ سچ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ڈاکٹر نصیرالدین ہاشمی نے یہ قطعاً نہیں کہا کہ اردو کہ ابتدا دکن سے ہوئی، پھر بھی لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ نصیرالدین ہاشمی دکن کو اردو کا مولد قرار دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا تمام باتوں کا خلاصہ کیا جائے تو یہ باتیں نکل کر سامنے آتی ہیں کہ دو قوموں کی باہمی ارتباط اور میل جول سے ایک الفاظ دوسرے میں مل جاتے ہیں مگر یہ کسی نئی زبان کے بنیاد کی ضامن نہیں ہو سکتیں، شورسینی کا دوسرا نام برج بھاشا ہے یہ بھاشا سندھ سے بہار اور لاہور سے مالوہ تک بولی جاتی تھی، اردو بھاشا کا مخزن اس کو قرار دیا گیا تھا مگر جدید تحقیقات کی رو سے یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔

اردو کی ابتدا مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے ہوئی، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ دیسی زبان اور غیر ملکیوں کے یعنی مسلمانوں کی زبان کے امتزاج سے اردو کی پیدائش ہوئی اس سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کا اقتباس ملاحظہ کیجئے :

" کوئی زبان دو یا دو سے زیادہ زبانوں سے مل کر کبھی اس طرح وجود میں نہیں آتی کی اصل و اساس کے لحاظ سے وہ دونوں میں سے ایک زبان نہ ہو۔ دونوں کا مجموعہ ہو، کچھ بنیادی عناصر اس نے ایک زبان سے لیے ہوں اور کچھ دوسری سے اور یہ مشترک عناصر یکساں اور مساوی درجے کے ہوں۔ یہ قیاس صحیح کے خلاف ہے، زبانوں اور بولیوں کی تاریخ اس کی تردید کرتی ہے، دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے ملاپ سے کبھی کوئی تیسری زبان وجود میں نہیں آتی، کہ وہ اصلاً ان سے جدا ہوں، زبان زبان سے استفادہ کرتی ہے کچھ دیتی ہے اور کچھ لیتی ہے، یہ لین دین فرعی یا غیر اساسی ہوتا ہے دوسری زبان سے استفادہ کرنے کے بعد زبان کی فطرت نہیں بدلتی روپ بدل جاتا ہے۔''

(داستان زبان اردو، ڈاکٹر شوکت سبزواری)

نصیرالدین ہاشمی نے اردو کے ابتدا سے متعلق چار نظریوں کا ذکر کیا جن میں اردو کا مولد (1)



CamScanner



پنجاب (۲) سندھ (۳) دکن اور (۴) دو آب گنگ و جمن کو بتایا، اس میں سے سندھ پنجاب اور دکن والے نظریوں کو انہوں نے خود رد کر دیا۔ دو آبہ گنگا و جمنا کو اردو کی جائے پیدائش بتایا کہ اس زمانے میں جدید ہند آریائی دور کی پراکرت بولی جاتی تھی اور اسی دیسی زبان سے اردو کی پیدائش ہوئی۔

**Dr. Afsana Parween**
Asst. Professor (Need Based)
Department of Urdu
Ranchi Women's College
Ranchi (Jharkhand)
Mob.- 62063 34460

ISSN : 2582 - 3612

ڈاکٹر قمر نازنین

# مکاتیبِ غالبؔ کا سماجیاتی مطالعہ

موضوع کے بنیادی عنصر پر اپنے خیال کا اظہار کرنے سے پہلے میں یہ ضروری سمجھتی ہوں کہ پہلے لفظِ خط پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے۔ دراصل خط یا مکتوب اپنے دورانِ دل کے اظہار کا ایک ایسا طریقہ ہے کہ جس سے ہر خاص و عام واقف ہے اور اپنی ضرورت کے مطابق ایک دوسرے پر اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ مگر فرق خاص و عام یہ ہے کہ آدمی اپنی ضرورت کو مدِ نظر رکھتا ہے جبکہ ایک اہلِ فن اُس میں اپنی فنکاری کے جلوے دکھاتا ہے۔ یہ فن کوئی نیا فن نہیں ہے بلکہ اس کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس میں مختلف گوشے نظر آئیں گے۔ جن پر اس فن کی تحقیق میں محققین نے بڑی جاں سوزی اور کاوشوں کے ذریعہ اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

دراصل خط مکتوب نگار کی زندگی کا یک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں اس کی زندگی کا ہر پہلو اُجاگر ہوتا ہے۔ اُس کی شخصیت، اس کا ماحول، اس کے خاندان کا پس منظر، اس کی اقتصادی، تمدنی، تہذیبی، سماجی، معاشرتی وثقافتی عوامل کی تصویریں نظر آتی ہیں، اور دوسری کیفیت اس کی یہ بھی ہے کہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی نجی زندگی بھی اس میں اُبھر کر آجاتی ہے۔ کیونکہ مکتوب نگاری کے دوران مکتوب نگار ایک ایسے عالم میں پہنچ جاتا ہے جہاں اُس میں اور مکتوب الیہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا گویا خط لکھنے والا اپنے جذبات کے اتار چڑھاؤ میں بے تکلف ہو جاتا ہے اور یہ بے تکلفی اُس کی کیفیت اور جذبات کی پوری طرح طرح عکاسی اور ترجمانی کرتی ہے وہ ایک دوسرے میں اس طرح ضم ہو جاتے ہیں اس طرح کہ ''میں'' اور ''تو'' نہ رہ کر صرف ''میں'' ہو جاتا ہے۔ ایسے عالم میں ایک دوسرے کے راز راز نہیں رہتے، جس سے ان کی نجی زندگی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ایسے خطوط میں فن کاری کی ادبی زندگی بھی رونما ہوتی ہے۔ اور ایسے نجی اور ادبی خطوط سے قاری کو فن کار کے حالات اس دور کا ادبی مذاق اور میلان، سماجی اور معاشی پس منظر کا بھی پتہ چلتا ہے۔

مکتوب نگاری کو مرزا غالبؔ نے کیا لب ولہجہ اور آہنگ عطا کیا اور اس کو ایک نئے اور اچھوتے انداز میں ڈھال کر اپنے آپ کو اس فن کا سنگِ میل بنالیا اور یہ حقیقت بھی ہے کہ غالبؔ سے پہلے خطوط نگاری پر فارسی کے اثرات نظر آتے ہیں، نظر ہی نہیں بلکہ فارسی کا انداز اردو پہ مسلط نظر آتا ہے، مگر غالبؔ نے اپنی

R.N.I. : BIH URD/2019/78036

CS CamScanner



جولانیِ فطرت سے اس انداز، روش اور اسلوب کو بالکل ہی بدل دیا اور اس فن کا رخ موڑ کر ایک نئے انداز کی داغ بیل رکھی جو عوام و خواص کا مطمعِ نظر بن گئی۔ اردو میں اس کے موجد ہونے کا سہرا مرزا غالبؔ ہی کے سر ہے۔

یہاں اس مقام پر ایک سوال ضرور قاری کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اردو میں مکتوب نگاری کا باقاعدہ سلسلہ کب سے شروع ہوا۔ اس سلسلے میں کسی تاریخ کا تعین ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ مطالعہ تاریخ ادب سے یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ ہمارے ادب میں یعنی اردو ادب میں باقاعدہ طور پر مکتوب نگاری کی تاریخ پر کوئی معتبر اور مستند کتاب دستیاب نہیں ہے مگر اس کے باؤجود اس سے انحراف نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ روایت بھی اردو میں فارسی ادب کی مرہونِ منت ہے۔ اس کی جب جستجو کی جاتی ہے تو ہمیں ہر بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو مکتوب نگاری کی ابتدا بیسویں صدی عسوی کے نصف آخر میں ہوئی۔ کیونکہ غالبؔ کے اردو میں خط لکھنے کا آغاز ۱۸۵۰ء سے معلوم ہوتا ہے ''اس سلسلے میں نورالحسن نقوی کا بیان ہے کہ...... ''مولانا حالیؔ کا اندازہ ہے کہ غالبؔ نے ۱۸۵۰ء کے کچھ بعد اردو میں خط لکھنا شروع کئے لیکن اس سے پہلے کے لکھے ہوئے خطوط دستیاب ہو چکے ہیں۔ جواہر سنگھ جوہر کے نام لکھے گئے پہلی دسمبر ۱۸۴۸ء کے خط کو مولانا غلام رسول مہرؔ غالبؔ کا پہلا اردو کا مکتوب قرار دیتے ہیں، خط پر تاریخ درج نہیں اس لئے مہیش پرشاد کی رائے ہے کہ اگست ۱۸۴۹ء میں مرزا ہر گوپال تفتہؔ کے نام لکھا گیا خط غالبؔ کا پہلا اردو خط ہو سکتا ہے۔''[1]

(غالب شاعر اور مکتوب نگار'' نورالحسن ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۰۶ ص۔ ۱۴۶)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ غالب نے ۱۸۵۰ء قبل یقینی طور پر اردو میں مکتوب نگاری شروع کر دی ہوئی۔ نا قلاتِ غالبؔ کراچی میں آفاق حسین آفاق نے غالبؔ کا پہلا خط ۹/ مارچ ۱۸۴۸ء میں تحریر کردہ بتایا ہے یہاں پروفیسر فیروز احمد صاحب کا نظریہ بھی اس سلسلے میں وزن رکھتا ہے جس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ :

> ''......۱۹ویں صدی کے نصف اول تک اردو خطوط بظاہر فارسی لوازم نامہ نگار کو ترک کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور غالبؔ تک آئی پہنچ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اردو مکتوب نگاری کا ابتدائی دور ختم ہو چکا اور دوسرا خاص دور انہیں کی ذات سے مخصوص ہو کر رہ گیا۔''

(غالبؔ شاعر اور مکتوب نگار'' نورالحسن ایجوکیشنل ید ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۰۶، ص۔ ۱۴۶)

مندرجہ بالا بیان سے بھی اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ اردو میں مکتوب نگاری کا زمانہ خصوصاً غالبؔ کے حوالے سے انیسویں صدی کے نصف آخر کا ہے۔

ISSN : 2582 - 3612

انیسویں صدی کے وسط میں اردو میں خط و کتابت کا رواج عام ہو گیا تھا، یہ عہد جبکہ فارسی کے زوال کا تھا۔ مگر پھر بھی اس دور میں اردو پر فارسی زبان کے اثرات کافی نظر آتے ہیں اس عہد کے اردو کے مکتوب نگاروں میں نمایاں نام مرزا قتیلؔ کا ہے۔ ان کے بعد رجب علی بیگ، سرور کا زمانہ ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء ان کے ہی ساتھ واجد علی شاہ اور غلام غوث کے مکاتب بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

''اردو مکتوب نگاری کے دوسرے دور میں سب سے نمایاں نام مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالبؔ کا ہے جنہوں نے ۱۸۴۹ء کے آس پاس مکتوب نگاری کی ایک ایسی انفرادی طرز ایجاد کی جوان سے شروع ہو کر ان ہی پر ختم ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ خط کو نصف ملاقات کا درجہ مرزا غالبؔ ہی نے دلوایا یہی سبب ہے کہ غالب کے مراسلہ کو مکالمہ کہا جاتا ہے اور اسی لئے غالبؔ کی خطوط نگاری نہ صرف اردو بلکہ تمام دنیا کی زبانوں کے خطوط میں اپنا نمایاں مقام رکھتی ہے۔''

(جوش ملیح آبادی فکر و فن، ص۔ ۲۸۸)

غالبؔ خطوط میں اس دور کی پوری عکاسی ملتی ہے۔ اس عہد کی تہذیب، تمدن، رہن سہن، کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، رکھ رکھاؤ، معاشرتی اور سماجی زندگی کے ہر پہلو میں ان کے خطوط میں کلی اور جزوی طور پر نظر آتے ہیں جن کے مطالعہ سے ہمیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا ہم اسی عہد کے اور غالب کے ہم عصر ہیں۔ یہ کیفیت اُن خطوط میں بدرجہ اتم موجود ہے کیونکہ ان کے خطوط میں ایک حساس دل کی دھڑکنیں ہیں۔ جو اس دور کی کیفیات کو بیان کر رہی ہیں۔ جس کی دھڑکن اور نفس کے اتار چڑھاؤ کا مکمل عرفان ہوتا ہے۔ ان کے خطوط سے باہمی تعلقات، خوشی اور غم میں شرکت، لباس کی یکسانیت کے سلسلے میں ان کی سماجی زندگی اور سماج میں شمولیت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ غالبؔ نے ایک ایسا انداز تقریر ایجاد کیا تھا کہ مراسلہ کا مکالمہ بنا دیا تھا انہوں نے خود اپنے خطوط کیلئے فرمایا ہے کہ ہزار کوس سے بہ زبان قلم نالس کیا کرو۔ ہم میں وصال کے مزے لیا کرو ان کے خطوط کو ڈرائنگ روم کی گفتگو کہا جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہوش ربا دور کے بعد دلّی وہ دلّی نہیں رہی تھی جو ایک مثال تھی جو یکتائے روزگار تھی مگر اب وہ زبوں حالی اور بربادی کی دم توڑتی ہوئی اور مٹتی ہوئی دلّی رہ گئی تھی۔ جس سے دلّی کی معاشی اور اقتصادی حالات بگڑنے لگے تھے ۱۸۵۷ء کے خونی ہنگاموں کی وجہ سے دہلی میں قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا تھا اور جو لوگوں بچ گئے تھے وہ اپنا دوسرا جنم سمجھ رہتے تھے جسے تفتہؔ کے نام خط میں مرزا لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں ایک بزرگ تھے کہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے اور منشی



CamScanner



نبی بخش ان کا نام اور حقیرؔ تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا اگر چہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہیں۔''

(اردوئے معلیٰ از غالبؔ، ص۔ ۷۲)

ایسے ہی ایک خط میں جو تفتہؔ کے نام ہے اس دور کے سیاسی بندوبست کا حال بیان کرتے ہیں :

''صاحبان انگرج نے ریاستوں نے باب میں ایک قانون وضع کیا ہے یعنی جو رئیس مرجاتا ہے سرکار اس ریاست با قابض و متصرف ہو کر رئیس زادہ کے بالغ ہونے تک بندوبست میں کوئی قدیم الخدمت موقوف نہیں ہوتا۔''

(اردوئے معلیٰ از غالب، ص۔ ۵۴)

ایسے بہت سے خطوط کے حوالے ہیں جن سے ہم کو اس وقت کے سیاسی حالات کی معلومات ہوتی ہے اور غدر کا منظر اس طرح ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے کہ جیسے ہم بھی اس وقت کا حصہ ہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے سامنے ہو رہا ہے ان لوگوں کے جذبات اور احساسات کو ہم محسوس کرتے ہوئے ہماری آنکھوں کے آنسو کو روک نہیں پاتے۔

سماجی زندگی کے بدتر ہونے کی صاف تصویر میں نظر آرہی تھیں، یہ میر مہدی کے نام غالبؔ کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے زمانے میں دہلی کا لال قلعہ، جامع مسجد اور چاندنی چوک، دہلی والوں کی سماجی زندگی کے حصے تھے جہاں لوگ ایک دوسرے سے ملتے تھے اور لال قلعہ میں شاہی دربا ہوتا تھا۔ مسجد کے باہر اور چاندنی چوک میں بازار لگتے تھے ہر ہفتہ جمنا کی سیر کا لطف اٹھایا جاتا تھا جو سماجی زندگی کا ایک حصہ تھے۔

مرزا میر مہدی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''جو پائے حالِ دلی سلام لو۔ مسجد داگزاشت ہو گئی، چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کہابیوں نے دکانیں بنائیں، انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی مہتم ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش، مولوی صدرالدین، تفضّل حسین خاں تین یہ، سات اور۔''

(اردو کے معلیٰ از غالبؔ، ص۔ ۱۵۵)

چونکہ مرزا کے آخری زمانے میں دہلی میں بیرون دہلی کے لوگ بے تھے اور دہلی کے بہت سے لوگ ترک وطن کر گئے تھے جس کی وجہ سے دہلی سماجی حالات منتشر ہو گئے تھے اس کا ذکر کرتے ہوئے مرزا نے منشی ہرگوپال تفتہ کو خط میں لکھا ہے ملاخط ہو۔

ISSN : 2582 - 3612

''صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت در پیش آئے شعر کہے دیوان جمع کئے اسی زمانے میں ایک بزرگ تھے کہ ہمارے تمہارے دوست تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر ناص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا اگر صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی بخش صاحب کو بھیجا اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و تخلص بہ تفتہ ہو آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام دلی اور اس محلّہ کا نام بلی ماروں کا محلّہ ہے، لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈ ھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔

ہنوز البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں، اب پوچھو کہ تو کیونکر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں تو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار میں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجا نریندر سنگھ بہادر والئی پٹیالہ کے۔ راجا نے صاحبان عالیشان سے عہد تھا کہ ہر وقت غارت دہلی یہ لوگ بچ رہیں۔

چنانچہ بعد فتح راجا سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور یہ شر کہاں۔ مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیر دار، خوشن دار، دولتمند، اہل حرفہ کوئی بھی ہے۔ مفصل حال سے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور وارد گیر میں مبتلا ہیں۔ مگر دو نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک اور ہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کے اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکر سمجھ خواہی مزدوری جانو۔ اسی فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے اہل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہوتا حکام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے



CS CamScanner



کوئی بات پائی نہیں گئی لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے پکڑے ہو آئے ہیں میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں دروازہ سے باہر نکل نہیں سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔''

(اردوئے معلیٰ از غالبؔ، ص۔۲۷تا۳۷)

غرض کہ اس خط میں غالبؔ نے اپنی کسمپرسی، ولی کی تباہ حالی، معاشرے اور سماج کی بگڑی ہوئی حالت، تہذیب اور تمدن کی چاک گریبانی اور پرانے رشتوں کی طرف سے مایوسی ان سب کا ذکر کیا ہے۔ جس سے ہمیں اس دور کے نہ صرف حالات کا پتہ چلتا ہے بلکہ غالبؔ کے سماجی رشتوں اور سماجی زندگی کی مکمل تصویر بھی نظر آتی ہے۔ یہ سماجی تصویر جب سامنے آتی ہے تو دلی کی وہ پرانی زندگی کا نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ جس میں ہر ہفتے جمنا کے پل کی سیر جامع مسجد کے گرو، ہر ہفتے کے بازار، پھول والوں کا ہر سال کا میلا یہ سب باتیں سماجی زندگی سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس کے علاوہ دہلی کے شاہی دربار کا اہتمام، جاگیرداروں کے درباریوں کی شاہی دربار میں عزت مہاجنوں کا بلایا جانا یہ تمام سماجی زندگی کے حصے ہیں جن کو غالبؔ کے خطوط پیش کرتے ہیں اس سلسلے کی ایک اور کڑی ملاحظہ فرمایئے جس میں اس کے عہد کے سماجی، معاشرتی، اقتصادی، تمیز بی، زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

یہ خط چودھری عبدالغفور کو لکھا گیا ہے جس کا ایک حصہ ملاحظہ ہو :

''یہاں شہر ذمہ رہا ہے بڑے بڑے تامی بازار اور اردو بازار اور خانم بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا۔ اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھا۔ اور دکان کہاں تھی برسات پھر مینھ نیں برساس اب تیشہ اور کلندی کی طغیانی سے مکانات گر گئے۔ غلّہ گران ہے رت ارزاں ہے میوہ کے مول اناج بکتا ہے ماش کی دال سیر، باجرہ ۱۲ سیر، گیہوں ۱۳ سیر، چنے ۱۶ سیر، گھی ایک سیر، ترکاری مہنگی ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ کنوار کا مہینہ جیسے جاڑے دوار کہتے ہیں پانی گرم دھوپ تیز اور لو چلتی ہے جیٹھ اساڑھ کی گرمی پڑتی ہے۔''

(اردوئے معلیٰ از غالبؔ، ص۔۱۳۲)

ایک اور خط میں میر مہدی کو برسات کے بارے میں لکھا ہے جس میں نہ صرف برسات کا حال ہے بلکہ اس کا تعلق لوگوں کے رہن سہن تہذیب و تمدن اور آداب معاشرت سے بھی ہے اور اس کے ملاوہ ان

ISSN : 2582 - 3612

چیزوں کا ذکر بھی ہے جن کا استعمال اس عہد میں ہوتا تھا مگر آج وہ چیزیں عنقا ہیں۔اور بہت استعمال میں آنے والی چیزوں کا اس دور میں کوئی نام بھی جان جاتا ہے ملاحظہ ہو۔

میں بھولا نہیں تجھکو اے مری جان
کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکان

برسات کا حال نہ پوچھو خدا کا قہر ہے۔قاسم خان کی گلی سعادت خاں کی شہر ہے میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیگ خاں کے کٹر وکی طرف کا درواز وگر گیا۔مسجد کی طرف دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا بڑھیاں گرا چاہتی ہیں صبح سے بیٹھے کا حجرہ جھک رہا ہے چھتیں چھلنی ہوگی ہیں بیٹھ گھری بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برے، کتابیں، قلمدان سب توشہ خانہ پر فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا ہے کہیں چلمچی دھری ہوئی۔''

(اردوئے معلیٰ از غالبؔ، ص۔۱۲۸)

سماجی پس منظر میں ایک اور خط ملاحظہ فرمائیں جو میر مہدی کو لکھا گیا ہے:

''کال کی اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے آج اکیسواں دن ہے آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ انکو جگنو سمجھ لیتے ہیں اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آتی ہے کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا ہزار ہا مکان گر گئے سنکڑوں آدمی جا بجا دبکر مر گئے گلی گلی ندی بہہ رہی ہے قصہ مختصر وہ ان کا تھا کہ مینہ نہ برسا اناج نہ پیدا ہوا یہ پن کال ہے پانی ایسا برسا کو بوئے ہوئے دانے بہہ گئے جنہوں نے نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔''

(عود ہندی از غالب، ص-۱۴۱)

**Dr. Qamar Naznin**
Asstt. Professor
(Guest Faculty)
Deptt. of Urdu
Rajasthan University
Jaipur (Rajasthan)
Mob.- 99837 00001



CamScanner



ڈاکٹر شوکت علی

# حافظ شیرازی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا تقابلی مطالعہ

تقابلی مطالعے کا مطلب ایک ادب کی تاثیر دوسرے ادب پر اور دو ادب کے درمیان مشابہتیں اور یکسانیت کا قیاس کرنا ہے۔اگر حافظ شیرازی اور اردو ادب کے سیاستدان، ادیب اور شاعر مولانا ابوالکلام آزاد کی شاعری پر نظر دوڑائی جائے ان میں بہت مشابہتیں نظر آتی ہیں۔شاید شروع میں یہ کہا جائے کہ ایک سیاستدان اور ایک شاعر کے درمیاں کیا مشابہتیں اور یکسانیت موجود ہوسکتی ہیں لیکن جب غور کیا جاتا ہے تو ان کے درمیان بہت مشابہتیں اور یکسانیت نظر آتی ہیں۔حافظ شیرازی اور مولانا آزاد کی زندگی میں کئی لحاظ سے بہت مماثلت اور دلچسپ یکسانیت دکھائی دیتی ہیں۔اس مقالے میں کوشش کی گئی ہے کہ فارسی کے بادشاہ غزل یعنی حافظ شیرازی اور ہندوستان کے نامور مسلمان متفکر کے بارے میں مطالعہ کریں۔مثال کے طور پر دونوں شعراء کے اشعار میں مشترک ادبی صنایع موجود ہے۔حافظ شیرازی کی تاثیر آزاد کے اشعار میں نمایاں ہے۔دونوں شخصیت مسلمانوں کی پس ماندگی کے بارے میں سوچتے تھے۔دونوں شخصیت کی شاعری میں مشترک تراکیب اور مضامین کے بارے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے:۔خواجہ شمس الدّین محمّد حافظ شیرازی کی مختصر سوانح عمری:

"ترجمان بلاغت لسان الغیب خواجہ شمس الدّین محمّد حافظ شیرازی سنہ 727 ہجری قمری مطابق 1315ء شیراز میں پیدا ہوئے۔اور 792 ہجری قمری مطابق 1390ء شیراز میں وفات پائی۔آپ کے دادا اصفہان کے مضافات کے رہنے والے تھے۔اتابکان فارس کے زمانے میں شیراز میں آئے۔اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔خواجہ صاحب کے بچپن ہی میں والد خواجہ بہاء الدّین انتقال کر گئے تھے۔اس لئے تھوڑے عرصے میں ہی باپ کی کمائی ختم ہوگئی۔گھر میں فاقے ہونے لگے۔خواجہ صاحب سن شعور کو پہنچے تو خمیر بنانے کا پیشہ اختیار کیا۔آدھی رات سے اٹھ کر صبح تک خمیر گوندتے۔گھر کے پاس ہی ایک مکتب تھا۔محلے کے سب لڑکے اسی میں پڑھتے تھے۔خواجہ صاحب مکتب کے پاس سے نکلتے تو دل میں تعلیم کا شوق پیدا ہوتا۔رفتہ رفتہ یہ شوق اس قدر بڑھا کہ مکتب میں داخل ہوگئے۔خمیر بنانے سے کچھ حاصل ہوتا تو اس میں سے ایک تہائی ماں کو اور ایک تہائی معلّم کو دیتے۔مکتب میں قرآن مجید حفظ کیا۔یہی مناسبت آپ کے

ISSN : 2582 - 3612

تخلص کا موجب ہوئی۔ اس زمانے میں شعر وشاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ خواجہ صاحب نے بھی طبع آزمائی کی۔ شروع میں چونکہ طبیعت موزوں نہ تھی آپ کے بے تکے اشعار اور لغو گوئی کا جگہ جگہ مذاق اڑایا جاتا۔ دو سال تک یہی حالت رہی۔ ایک دن حد سے زیادہ رنجیدہ ہوئے اور بابا کوہی کے مزار پر جا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ان کو لقمہ کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جاؤ اب تجھ پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے۔ نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جناب خضر علیہ السلام ہیں۔ صبح کو اٹھے تو اپنی شہرہ آفاق کی غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
ور ان ظلمت شب آب حیاتم دادند

یعنی: گذشتہ رات صبح کے وقت انہوں نے مجھے غم سے نجات دے دی/ اور اس تاریکی میں انہوں نے مجھے آب حیات دے دیا۔

بیخود از شعشۂ پرتو ذاتم کردند
بادہ از جام تجلی صفا تم دادند

ترجمہ: انہوں نے ذات کے پرتو کے نور سے مجھے بیخود بنا دیا/ صفاتی تجلی کے جام سے مجھے شراب دے دی۔

چہ مبارک سحری بود و چہ فرخندہ شبی
آن شب قدر کہ این تازہ براتم دادند

ترجمہ: کیا بابرکت صبح تھی اور کیا مبارک رات تھی وہ شب قدر جس نے مجھے تازہ دستاویز دے دی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے بچپن سے ہی شاعری کا آغاز کیا:

"مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش ماہ ذی الحجہ سنہ 1305 ہجری میں شہر مکہ میں ہوی۔ انگریزی تاریخ کے مطابق یہ زمانہ 9 / اگست سے 6 /ستمبر ?1888ء کے درمیان کا ہوتا ہے۔ لہٰذا اسی دوران مولانا آزاد کی پیدائش ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام مولانا شیخ خیرالدین تھا۔

مولانا آزاد کی تعلیم عربی و فارسی سے شروع ہوئی۔ وقت کا مسلمہ نصاب درس نظامی تھا، جو انہوں نے 13 ؍برس کی عمر میں مکمل کر لیا غرض ان کی اس دور کی درسی مشغولیتوں میں اردو کا کوئی مقام نہیں تھا، جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے: ''اردو کے ابتدائی اسباق اپنے والد کے خادم خاص حافظ ولی اللہ سے پڑھے اور مشق سے اس میں اتنی صلاحیت پیدا کر لی کہ تیرہ برس کی عمر میں وہ مدارس کے اخبار جریدہ روزگار کا مطالعہ کرنے اور اس سے استفادہ کرنے لگے تھے اسی زمانہ میں انہوں نے اس پرچے میں حالی کی کتاب ''یادگار



CamScanner



غالب'' کا اشتہار دیکھا جس سے کتاب دیکھنے کا شوق پیدا ہوا انہوں نے اسے منگوا کر پڑھا۔ یہ ان کا غالب سے پہلا تعارف تھا۔ غالب نے نو سال کی عمر کو پہنچے سے پہلے ہی فارسی میں اشعار لکھنے شروع کر دیے تھے۔ اپنی ساری عمر انھوں نے بہ بانگ دہل فارسی کو اپنی معشوق اول قرار دیا لیکن ایسی شہادت ہے کہ اس ابتدائی عمر میں بھی وہ ساتھ ہی ساتھ اردو میں بھی لکھتے تھے۔ حالی نے لکھا ہے کہ کنھیا لال نامی ایک شریف آدمی نے آٹھ یا دس سال کی عمر میں غالب کی تصنیف کی ہوئی ایک مثنوی اپنے ہاں محفوظ رکھی تھی۔ غالب اس کا وجود فراموش بھی کر چکے تھے لیکن سال بہ سال کے بعد جب یہ مثنوی انھیں دکھائی گئی، انھوں نے اسے بڑی مسرت کے ساتھ پڑھا۔ ظاہر ہے اس عمر میں لکھے ہوئے غالب کے اشعار میں اتنی خوبی تھی کہ وہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آگرہ کے ایک معزز امیر اور شاعر حسام الدولہ ایک دفعہ اس کم سن شاعر کے بعض اشعار لکھنوء کے مشہور شاعر میر کے پاس لے گئے۔ غرض غالب اور آزاد کی طبع زاد شاعری ایک ہی تھی۔

اگر چہ مولانا ابوالکلام آزاد حافظ شیرازی سے تقریباً سات سو برس کے بعد کا شاعر ہے، لیکن ایسا لگتا ہے ان کے ہم عصر ہیں۔ ایسی حالت میں علامہ اقبال کا شعر یاد آتا ہے جو فرماتے ہیں۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈُوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈُوبے اِدھر نکلے

اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان اور اہل قرآن پاک کے آدمی ہمیشہ زندہ ہیں، اور ان کی سنہری باتیں انسان کے کان میں گونجتی ہیں۔

مولانا آزاد کی علمی وادبی خدمات کے متعلق اگر جائزہ لیا جائے تو ایک جامع دفتر کھل سکتا ہے۔

حافظ شیرازی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا دور سماجی اور سیاسی لحاظ سے تاریخ کا تاریکی دور تھا۔ یعنی ایران میں منگولوں اور ہندوستان میں انگریزوں کے حملے نے ان کی زندگی میں کافی حد تک متاثر کیا۔ عام طور پر آزاد اور حافظ کے اشعار کے مفہوم میں ذو معنی شئی موجود ہے۔ اس کی علّت بھی ان کا سماجی اور سیاسی دور ہے۔ آزاد اور حافظ دونوں ملامت کرنے والے شاعر ہیں۔ اور یہ ملامت گری ان کے اشعار کے مفہوم میں ان کی عرفانی نکتہ نظر سے ہے۔ آزاد نے شعر وشاعری میں کم وبیش حافظ کی پیروی کی ہے۔

مولانا آزاد نے سنہ 1945ء میں رہائی کے بعد بعض مکاتیب نواب صدر یار جنگ کے نام سے لکھا ہے۔ انہوں نے ہر خط میں حافظ شیرازی کے شعر سے اپنا خط شروع کیا ہے۔ مثال کے طور پر۔

ای غائب از نظر کہ شدی ہم نیشین دل
می بینمت عیان و دُعا می فرستمت

(معنی: اے نظر سے غائب کہ تو دل کا ہم نشین ہے/ میں تجھے دعا دیتا ہوں اور تیرے پاس بھیج رہا ہوں۔

جب مولانا آزاد اپنے خط کو حافظ شیرازی کے شعر سے شروع کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے مولانا آزاد حافظ شیرازی کے اشعار سے بہ خوبی واقف ہیں۔

نسیم سحر کی ترکیب آزاد اور حافظ کے شعر میں ۔

ای نسیم سحر آرمگہ یار کجاست
منزل آن مہ عاشق کش عیار کجاست

اے نسیم سحری گر بہ حضورش گذری/عرضہ دہ شوق کہ در جان فگاری دارم (آزاد)

مولانا آزاد نے حافظ شیرازی کی طرز پر شاعری بھی کی ہے۔مولانا آزاد نواب صدر یار جنگ کا نامہ منظوم:

"اگست 1945ء میں کشمیر گئے تھے اور گل مرگ میں قیام فرمایا تھا،اس زمانے میں یہ خط منظوم پہنچا۔

حبیب گنج (علیگڑھ)

6/رمضان المبارک 1364ہجری

محو نظارہ گل مرغ نگار ی دارم
کز خیالش بہ دل زار بہاری دارم
ای نسیم سحری گر بہ حضورش گذری
عرضہ دہ شوق کہ در جان فگاری دارم

مولانا آزاد کی ہر بات میں حافظ شیرازی کا نشان ہے۔قلعہ احمد نگر کی اسیری (از 9/اگست 1942ء تا 15/جون 1945ء) کے زمانے میں۔

دی پیر می فروش کہ ذکرش بخیر باد
گفتا شراب نوش و غم دل ببر ز یاد
گفتم بیا دمی دہدم بادہ تاب و ننگ
گفتا قبول کن سخن و ہرچہ بادا باد
بی خار گل نباشد و بی نیش نوش ہم
تدبیر چیست وضع جہان این چنین فتاد



CamScanner



پُرکن زبادہ جام دما دم بگوش ہوش
بشنواز و حکایت جمشید و کیقباد

(ابوالکلام)

شاید آسانی سے کہ سکتے ہیں کہ حافظ شیرازی کی پیروی اور تتبع میں اردو شاعری میں غالب دہلوی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد دوسرا شاعر ہے جو شراب کے لفظ سے اپنی شاعری میں بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح عمری میں اور ان کے اشعار پر غور کیا جاے تو حافظ شیرازی کے اشعار نظر آتے ہے۔مثال کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد اپنی کتاب ''غبار خاطر'' صفحہ 86 میں جب وہ قلعہ احمد نگر میں اسیر تھا حافظ شیرازی کا شعر یاد دلاتا ہے اور حافظ شیرازی کے شعر لکھتا ہے ۔

ای دل اندر بندزلفش از پریشانی منال
مرغ زیرک چون بہ دام افتد تحمل بایدش

(حافظ)

یعنی: دانا پرندہ جب جال میں پھنس جائے تو اسے بر باری کرنی چاہیے۔

یہاں مولانا آزاد اپنے آپ کو وہ پرندہ سمجھتا ہے جو انگریزوں کے قید میں ہے جو ان کے ہاتھ سے ریہائی کا راستہ صرف صبر و بردباری ہے۔

ابوالکام آزاد اور حافظ شیرازی کے درمیان فرق یہ ہے کہ حافظ شیرازی کبھی نثر نگار نہیں تھے لیکن آزاد ایک عظیم شاعر ہونے کے باجود ایک ماہر نثر نگار بھی تھے۔ان کے نثری آثار میں آیات قرآنی،اشعار، تشبہات،مترادفات،جملات قریب المفہوم اور تراکیب فارسی و عربی نظر آتا ہے لیکن جملات بہت سادہ اور قابل فہم ہیں تاکہ اردو زبان پڑھنے والے بھی آسانی سے سمجھ سکیں۔مثال کے طور پر ترجمان القران صفحہ 62 میں اسی طرح ہے:

"وحی الٰہی کے مستور و محبوب چہرے نے جب زمین فاران میں اپنا نقاب اُلٹا تو اس کے جمال حقیقت کا اولین نظارہ اسی سورہ فاتحہ میں تھا اور پھر یہی سورہ ہمیشہ کے لیے پہلی قرار پائی کہ کرہ اَرض پر نوع انسان جب بھی جستجوئے حقیقت میں بیقرار ہو گی تو سب سے پہلے یہی جلوہ حق اس کے سامنے آوٗں گا،صرف ترتیب درس ونزول اور ترتیب کتاب پر ہی موقوف نہیں آگے چل کر تم کو معلوم ہوگا کہ کائنات تعلیم وسعادت انسانی میں جو کچھ ہے اس سے سب سے پہلی حقیقت یہی ہے اور اسی سورہ کی سات آیتیں ہیں۔اگر وہ ایک سفر

ISSN : 2582 - 3612

ہے تو اس کی پہلی منزل یہی ہے اگر وہ جمال ہے تو اس کا پہلا نظارہ یہی ہے اگر وہ ایک نغمہ ہے تو اس کا پہلا ترانہ یہیں سے اٹھتا ہے، اگر ایک وقت ہے تو اس کا پہلا دن اسی سے شروع ہوتا ہے اگر وہ درخت ہے تو اس کا اولین تخم اسی میں ہے اور اگر وہ ایک دائرہ سعادت ہے تو اس کا نقطہ اس کے سوا اور کوئی نہیں۔

"مولانا ابوالکلام آزاد کی شاعری کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ شاعری کو نثر کی بنسبت زیادہ پسند کرتے تھے اور قدیم شعر گوئی کو بھی حفظ کیا تھا انہوں نے کبھی کوشش نہیں کی تا کہ جدید تشبہات، تلمیحات، تراکیب اور استعارات سے فائدہ اٹھائے، وہ تمام جذبات کے ساتھ شاعری کرتے تھے اور جب بھی شعر و شاعری سے تھک جاتے تو نثر لکھتے تھے۔"

ابوالکلام آزاد اپنی کتاب " غبار خاطر صفحہ 3 میں حافظ شیراز کی زمین میں اس طرح شاعری کرتے ہیں۔

ای غائب از نظر کہ شدی همنشین دل
می بینمت عیان دعا می فرستمت
حافظ شیرازی کا شعر بھی یہ ہے
ای غائب از نظر بہ خدا می سپارمت
جانم بسوختی و بہ دل دوست دارمت
(حافظ)

اے نظر سے غائب تم کو اللہ کی حفاظت میں سپرد کرتا ہوں/ اگر چہ تو نے میرے دل کو توڑ دیا لیکن اس کے باوجود میں تم کو تہ دل سے محبت کرتا ہوں۔

**Dr. Shokat Ali**
Mohalla- Narol
P. O. - Chhatral
Poonch ( J & K)
Mob.- 96826 48125



CamScanner



ڈاکٹر روزی ناز

# اکرام باگ کی افسانہ نگاری

اکرام باگ کا شمار برصغیر کے جدید لب ولہجہ کے معتبر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ حمید سہروردی، علی امام نقوی اور اس دور کے دیگر افسانہ نگاروں کی فہرست میں اکرام باغ ایک معتبر نام ہے۔ ان کے افسانے کافی معیاری ہوتے ہیں اور فن پر پورے اترتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کے ناقدوں نے بھی انہیں کافی سراہا ہے اور ان کی حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ ان کے یہاں جو بیانیہ ملتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ عمدہ تشبیہات اور استعارات کا بہتر انداز میں استعمال کرتے ہیں جس کے سبب ان کے افسانے قارئین کے دل کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ان کے تجربات و مشاہدات، ان کی ذہانت اور ان کی صلاحیتیں بولتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان ہی عناصر کی بنیاد پر وہ اپنے افسانوں کے حوالے سے قارئین کی پسند اور ناقدین ادب کی کسوٹی پر بھی کھرے اترے۔ 'اندوختہ' اکرام باگ کا افسانوی مجموعہ ہے جس میں ۲۷/افسانے شامل ہیں۔ توفیق، اندوختہ، زوالِ رفت میں پچھلی دھند، چپی، تصحیح، دمِ افعی، آتشِ عنقا، حیات، مدعاتہہِ سنگ، برطرف فاصلے، رخش پا، عکسِ فنا، کابوس، تقطیب، تقلب، اقلیما سے پرے ہو، ادھورا پہیہ، آبگینہ، اندیشہ، کوچ، پڑاؤ، اسیرِ ہندسہ، ہندسۂ عبث، مفلوج، تقیہ بردار، جے سی بی اور اُس گلی سے، اس مجموعے کی زینت ہیں۔

اردو ادب میں جب جدیدیت کی صدا بلند ہوئی اور ادیبوں نے اس جانب توجہ کی اس رجحان کو بام عروج تک پہنچانے کی کوشش کی، ان میں اکرام باگ نے بھی اپنا بھر پور حصہ ڈالا۔ ان کے افسانوں میں جدیدیت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ ان کے افسانے ایک خاص قسم کا اثر رکھتے ہیں جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، یہ ان ان کیا فسانے کا خاص وصف ہے۔ ان کے افسانے کے مطالعہ کے بعد قاری اپنے آپ کو ایک تحیراتی دنیا میں پاتا ہے۔ ان کا منفرد اسلوب اور ان کے افسانے میں واقعہ نگاری انہیں اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں ممتاز کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

وہ مسلسل شمس الرحمٰن فاروقی کے 'شب خون' میں شائع ہوتے رہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق'' اکرام باگ کے افسانوں کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی کچھ پراسرار، کچھ خوف آگیں فضا

ISSN : 2582 - 3612

ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ہماری دنیا میں موجود ہوتے ہوئے بھی کسی ایسی جہت میں گامزن ہے جو اسے روزمرہ کی دنیا سے الگ لے جانے کے لیے کوشاں ہے۔عام دنیا کی اشیا اور مقامات اور کوائف بھی ان افسانوں میں کچھ سرمئی، تاریک، گرد آلود رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔''مشرف عالم ذوقی اپنے ایک مضمون 'رام باگ: گم ہوتا ہوا کارواں' میں اکرام باگ کے حوالے سے کچھ یوں رقم طراز ہیں۔ملاحظہ ہو:

''اکرام باگ، قمر احسن مجھ سے کافی سینئر تھے، ایک زمانہ وہ بھی تھا جب یہ نام افسانے کی دنیا میں عزت واحترم سے لئے جاتے تھے، مجھے قمر احسن بھی پسند تھے اور اکرام باگ بھی، اس کے باوجود کہ یہ دور فکشن کی بھول بھلیوں کا دور تھا، بے سر پیر کی کہانیاں حاوی تھیں، ایک دلچسپ بات اور تھی۔شروع کی کہانیوں میں علامتیں، بہت مبہم یا بوجھل نہیں تھیں لیکن اکرام باگ سے قمر احسن تک یہ بات شدت سے محسوس کی جارہی تھی کہ کہانیاں دراصل یوں لکھنی چاہئیں جس کی تفہیم ممکن نہ ہو۔شوکت حیات نے تو بعد میں باضابطہ اس بات کا اعلان بھی کیا کہ کہانی لکھنے کے بعد اگر قاری کہانی کے بارے میں دریافت کرتا ہے تو مصنف یقیناً اسے سمجھا پانے میں ناکام رہے گا۔اس لیے کہ کہانی اترنے کی کیفیت الہامی ہوتی ہے۔''

(اکرام باگ: گم ہوتا ہوا کارواں- مشرف عالم ذوقی)

اکرام باگ کی نثر کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ بظاہر سادہ معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل ہوتی ہے پیچیدہ۔ان کے افسانے کو سرسری پڑھ کے نہیں گزرا جاسکتا۔ان کے افسانے کو قاری کو ٹھہر اور ڈوب کر مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں اور تب ہی کچھ باتیں قاری پر منکشف ہوتی ہیں ورنہ ان کی پوری باتوں تک قاری کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ان کے افسانے کا وصف قاری کی نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔اردو افسانے میں جدیدیت کا یہ وہ دور تھا جب اردو افسانے کی اسی خوبی کے سبب قاری اس سے دور ہونے لگے تھے۔اردو مختصر افسانوں میں پیچیدگیاں حد سے زیادہ بڑھنے لگی تھیں اور اردو افسانہ نگار اسے اپنا کمال سمجھنے لگے تھے۔اس حوالے سے اپنے مضمون 'رام باگ: گم ہوتا ہوا کارواں' میں دوسری جگہ مشرف عالم ذوقی نے اکرام باگ کی افسانہ نگاری کے ان ہی خواص کے متعلق اظہار خیال کیا ہے اور کچھ اس انداز میں، ملاحظہ ہو:

''میں تسلیم کرتا ہوں کہ قمر احسن اور اکرام باگ دونوں ہی بڑے تھے، مگر دونوں ہی جدیدیت کی یلغار کا شکار ہوئے، جب زمانہ تبدیل ہوا، اردو فکشن میں بھی تبدیلیاں آنے لگیں، ہماری دنیا سائنس اور ٹکنالوجی کی ریس میں



CS CamScanner



بہت آگے نکل گیی، اس وقت شدت سے یہ احساس ہوا ہوگا کہ ہم کیا لکھ رہے ہیں؟ یا یہ کہ اب دنیا تبدیل ہو گیی ہے، جدیدیت کو بھی نیا سانچہ درکار ہے۔ کچھ غائب ہوگئے، کچھ خاموش ہوگئے، کچھ کو دردناک سزا ملی، اکرام باگ کی سوچ اپنے وقت سے آگے کی سوچ تھی، مگر یہ شخص بھی گمنامی کی آغوش میں چلا گیا، پھر گمنامی سے عدم آباد۔''

(اکرام باگ: گم ہوتا ہوا کارواں- مشرف عالم ذوقی)

ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ دیوار میں چنی ہوئی اینٹ کی مانند معلوم ہوتا ہے۔اگر ایک اینٹ بھی نکال دی جائے تو دیوار کی کلیت پر آنچ آتی ہے۔ان کی تحریریں بالکل گٹھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔وہ چھوٹے اور گٹھے ہوئے جملوں کا استعمال کرتے ہیں جس میں اثر آفرینی کا سحر قائم رہتا ہے۔یہی وہ سحر ہے جس سے قاری مطالعہ کے دوران اپنے آپ کو ایک الگ دنیا میں پاتا ہے۔ان کے افسانوں میں احساسات وجذبات اور زندگی کے رائیگاں جانے کا تصور حاوی نظر آتا ہے۔اکرام باگ کے افسانے عام طور سے ایسے کی داستانیں معلوم ہوتی ہیں۔انھوں نے تجرید اور شدت تاثر سے بھرے ہوئے افسانے لکھے ہیں۔ان کے افسانوں میں علامت کے پردے میں تمام تر رعنائی اور رنگینی کے ساتھ بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے جسے مطالعے کے دوران بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان بنیادوں پر اکرام باگ جدید دور کے افسانہ نگار کے طور پر تا دیر یاد رکھے جائیں گے۔

**Dr. Rozy Naz**
103/GMK Apartment
Samanpura, Rajabazar
Patna (Bihar)
Mob. 9431488311

ڈاکٹر محمد ولی اللہ

# شوکت حیات کی افسانہ نگاری: گنبد کے کبوتر کی روشنی میں

شوکت حیات اردو کے ایک مشہور افسانہ نگار تھے۔ ان کے افسانوں میں سماجی مسائل، انسانی نفسیات اور معاشرتی ناہمواریوں کو خصوصی موضوع بنایا گیا ہے۔ شوکت حیات ۷۰ کی دہائی میں ابھرنے والے ممتاز افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کو اردو ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ شوکت حیات نے بیسویں صدی کی ساتویں دہائی سے افسانہ نگاری کی ابتدا کی۔ ان کے افسانے معتبر و مؤقر رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں، لیکن ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' بہت مشہور ہوا تھا۔ ان کے کچھ مشہور افسانوں کے نام اس طرح ہیں۔ مثلاً: ''بھائی، بلی کا بچہ، گنبد کے کبوتر، سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ، گھونسلا، مادھو، کوبڑ، اپنا گوشت'' شوکت حیات کے افسانے تلخ سماجی حقیقتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں غربت، ناانصافی، اور انسانی دکھوں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ ان کے افسانے قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور ان میں معاشرے کی اصلاح کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ شوکت حیات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک ہی افسانے میں مختلف مسائل کی طرف قاری کے توجہ کو مبذول کراتے ہیں۔

ساتھ ہی شوکت حیات کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ معاشرتی حقیقت نگاری کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہمیں اپنے اردگرد کے معاشرے کی تلخ حقیقتوں کی عکاسی ملتی ہے۔

شوکت حیات کا اسلوب سادہ اور رواں ہے۔ وہ اپنی بات کو براہ راست اور واضح انداز میں کہتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہمیں کسی قسم کی پیچیدگی یا ابہام نہیں ملتا۔ ان کی زبان عام فہم ہے اور ان کے افسانے ہر طبقے کے قاری کے لیے قابل فہم ہیں۔

شوکت حیات نے انسان کے باطن کی بیکرانی کو دراصل اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ خواہ وہ رشتوں کی شکستگی کی وجہ سے ہو یا محبتوں کی صارفیت کی وجہ سے، سیاسی اتھل پتھل کی وجہ سے ہو یا معاشرتی کشاکش کی وجہ سے، اجتماعی نظام اس کا سبب ہو یا انفرادی گھٹن اس کی وجہ سے مختلف اور متنوع اسباب یا حالات کی وجہ سے انسان کا اندرون جن کیفیات کا اسیر ہوتا ہے، ان کیفیات کو متشکل کرنا شوکت حیات کا



CamScanner



امتیازی وصف ہے۔ ان کی ابتدائی کہانیوں میں عصری علامتی رنگ گہرا رہا، لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی الگ راہ خود متعین کر لی۔ بقول وارث علوی:

> ''شوکت حیات ان جیالے لوگوں میں سے ہیں جو نہ تو کسی نقاد کی توجہ کی پرواہ کرتے ہیں نہ دوسروں کی بخشی ہوئی بیساکھیوں پر راہ ادب طے کرتے ہیں۔ وہ اپنا راستہ خود بناتے ہیں اور اپنے اظہار و بیان کے طریقے آپ ہی ایجاد کرتے ہیں۔''

یہ واقعہ ہے کہ شوکت حیات کے افسانوں کا فکری محور انسان ہے۔ وہ فرد کے داخلی اور خارجی بحران کا مطالعہ اس کے سماجی منسلکات کے ساتھ کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بعض کرداروں کے توسط سے سماج کے کھوکھلے نظام اور دوغلے رویوں کے خلاف پرزور آواز احتجاج بلند کی ہے۔ اخلاقی و جذباتی بحران، سماجی وسیاسی ظلم و جبر، مسابقتی عہد میں زندگی کی بے مقصدیت اور بے معنویت، عالمی دہشت گردی کے نتیجے میں پنپنے والی بے یقینی اور بے نام خوف، طبقاتی استحصال کے منطقی نتائج وغیرہ کو انہوں اپنے افسانوں کے وسیلے سے پیش کیا ہے اور ان تمام مراحل میں تخلیقی ضبط کے دامن کو خوش اسلوبی سے تھامے رکھنا ہی ان کا فنی امتیاز ہے۔ شوکت حیات کی فکری اور فنی رچاؤ کے متعلق پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں کہ:

> ''وہ پختہ ذہن فنکار کی طرح آہستہ آہستہ اپنے ذہن کی تصویر کو مکمل کرتے ہیں اور اس کی تکمیل میں مناسب رنگ بھرتے ہیں جو ہر طرح متوازن بھی ہوتا ہے..... اب جو تصویر سامنے آتی ہے وہ حقیقت واقعہ کا عکس محض نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر ایک ایسی تخلیقی جوت ہوتی ہے جو اس کی شدت کو سرتا سر بڑھا دیتی ہے.... ایک انقلابی ذہن میں کیسی کیسی تخلیقی روشنی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کا ایک مکمل منظر نامہ شوکت حیات کے افسانے ہیں۔ اردو افسانے کی مجموعی تاریخ میں ان کی جگہ معتبر بھی ہے اور محفوظ بھی۔''

شوکت حیات اردو افسانے کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری میں ہمیں معاشرتی حقیقت نگاری، انسانی نفسیات، سادہ اسلوب اور علامت نگاری کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ ان کے افسانے اردو ادب کا ایک قیمتی اثاثہ ہیں۔

شوکت حیات افسانے کے مختلف رموز ونکات اور دیگر فنی وفکری لوازمات سے بخوبی واقف ہیں جس کا احساس قاری کو ان کے افسانے کو پڑھتے وقت بخوبی ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے مشہور افسانے ''گنبد کے کبوتر'' میں جو کہ ایک علامتی کہانی ہے اس میں بڑے ہی فنکارانہ انداز میں منظر کشی کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

ISSN : 2582 - 3612

''صبح کی نرم و نازک ہواؤں کے ساتھ تتلیاں اڑتی ہوئی پھولوں کی طرف آئیں۔بھنورے پھولوں کا چکر کاٹنے لگے۔گھونسلے سے گوریوں کے جھنڈ نے دانہ چگنے کے لئے اڑان بھری۔سورج کی نرم کچی کرنوں نے اس کی بالکنی کو گلے لگایا تو اسے محسوس ہوا کہ جینے کے جواز ابھی ختم نہیں ہوئے۔''

شوکت حیات کے افسانوں میں انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ ملتا ہے۔انہوں نے انسان کے اندرونی جذبات اور احساسات کو بڑی باریکی سے پیش کیا ہے۔ان کے افسانوں کے کردار عام انسان ہیں جو اپنی زندگی میں مختلف مسائل کا سامنا کرتے ہیں۔ان کرداروں کے ذریعے شوکت حیات نے انسانی فطرت کی پیچیدگیوں کو اجاگر کیا ہے۔

غریب انسان جس کے پاس زندگی کے شب و روز گزارنے کے بھی محدود وسائل ہوتے ہیں ان کے دل میں فطرت اور فطری چیزیں سے قدرتی لگاؤ ہوتا ہے۔وہ ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہیں اور حتیٰ المقدور اس کا مداوا کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔یہ اقتباس دیکھئے :

''وہ چپ چاپ ایک لوہے کی چھڑ لے کر اپنی بالکنی میں جا کر بیٹھ گیا۔بالکنی میں گوریوں نے چھوٹا سا گھونسلہ بنا رکھا تھا۔چوں چوں کی آویزیں رنگین روشن فوراوں کی طرح پھوٹ رہی تھیں۔اس نے اطمینان کی گہری سانس لی۔اس کے ایک ہاتھ میں تین سیل والی ٹارچ تھی۔اس کی بیوی بک بک کرتی رہی۔اسے برا بھلا کہتی رہی۔بالکنی سے ہٹنے کی ہدایت دیتی رہی۔اس نے طرح طرح سے اسے سانپ کے زہر سے ڈرانے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک نہ سنی، آخر کار اسے کہنا پڑا کہ اگر بہت ڈر لگ رہا ہے تو بالکنی کے دروازہ اندر سے بند کر لے۔وہ گوریوں کے گھونسلے کی حفاظت پر مامور رہے گا۔بہت دیر تک اس کی بیوی بچے منت سماجت کرتے رہے۔اسے خبطی اور بیوقوف قرار دیتے رہے۔لیکن اس نے گوریوں کی ننھی سی جانوں سے لاپروائی کے لئے خود کو کسی قیمت پر آمادہ نہیں کیا۔''

علامت نگاری: شوکت حیات نے اپنے افسانوں میں علامتوں کا بھی استعمال کیا ہے۔ان کی علامتیں ان کے افسانوں کو مزید گہرا اور معنی خیز بناتی ہیں۔ان کی علامتیں ان کے افسانوں کے موضوعات کو مزید وسعت دیتی ہیں۔

مس ریزہ اور سین دادا اور مسٹر تھامسن کے درمیان کے واقعے کو اس افسانہ میں شوکت حیات نے



CS CamScanner



بڑے ہی فنکارانہ انداز میں علامت کے ذریعے پیش کیا ہے۔اس میں کبوتر کو علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو کہ مس ریزہ کی ترجمانی کرتا ہے۔کہ جس طرح مسٹر تھامسن جیسے معمر شخص کے سامنے مس ریزہ نے اپنی مجبوری کے تحت سونپ دیا تھا۔اسی طرح سین دادا جس میں اس نے اپنے باپ کی جھلک دیکھی تھی وہ بھی اس کے جسم کو دیکھ کر رال ٹپکانے لگا اور اس کے نازک اور جوان جسم کو چھونے کی بھرپور کوشش کی اس مقام پر مس ریزہ مزاحمت بھی نہیں کر سکی بلکہ اس کو باپ کی یاد آنے لگی کہ باپ کے ساتھ وہ کیسے بے تکلف رہتی تھی اور یہ دوسرے مرد جو اس کے باپ کی عمر کے ہیں اس کے جوان جسم کو نوچ رہے ہیں شاید اس کی مجبوری اور کوئی ٹھکانہ نہ ہونے کا ہر کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔یہاں شوکت حیات نے بوڑھی عورت کے روپ میں مسٹر تھامسن اور سین دادا کو پیش کیا ہے اور کبوتر کو مس ریزہ کی علامت کے طور پر :

''بے اماں کبوتر۔۔۔شاید ان میں سے ایک بوڑھی عورت کے ہاتھوں کو حرارت پہنچانے کے لئے مذبح کا اسیر ہو گیا۔''

اس سے پہلے جو منظر نگاری کے حوالے سے عبارت پیش کی گئی ہے۔اس میں بھی علامت کا عنصر غالب ہے اور پیڑ پودوں اور دیگر اشیاء کو شوکت حیات نے علامتوں کے ذریعے ہی پیش کیا ہے۔

خود اپنے فکر و فن کے حوالے سے شوکت حیات نے وضاحت کی ہے، ملاحظہ فرمائیں :

''میرے افسانے اس تناظر میں دیکھیں جائیں کہ یہ وہ نئے جدید اور مابعد جدید افسانے ہیں جو دراصل نامیاتی اور امکانی ہیں اور انامیت، نامیاتیت اور امکانیت پسندی کے سرمدی اوصاف سے مملو ہیں۔ان افسانوں میں آج کے عہد اور آج کے انسان، اس کے مسائل کو نئے ڈھنگ، لہجے، تکنیک، ٹریٹمنٹ، موضوع، فکری بصیرت اور تیور کے ساتھ دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

یہ افسانہ ''گنبد کے کبوتر'' کئی زاویے سے اہمیت کی حامل ہے۔اس میں بیک وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کئی واقعات کو افسانہ نگار نے نوک قلم سے طنز کے تیر چلانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس میں اپنے معاشرے کی مختلف نفرت، ریاکاری، جنسی بے راہ روی اور فرقہ واریت وغیرہ کو نشانہ ستم بنانے کی طرف خاص اشارہ ملتا ہے۔یعنی اس افسانے میں کئی واقعات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔اب یہ قاری کے صوابدید پر منحصر کرتا ہے کہ وہ اس سے کیا اخذ و استفادہ کرتے ہیں۔

شوکت حیات نے اپنے افسانوں کے وسیلے سے عصری کرب کو پیش کیا ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا عنصر ہے جو انہیں اپنے ہمعصروں سے ممیّز کرتا ہے۔دراصل وہ ہے ان کی تخلیقی نثر اور ان

ISSN : 2582 - 3612

کا اسلوب۔شوکت حیات کے یہاں اختصار میں جامعیت کا فن درجہ کمال پر ہے۔ان کے یہاں کہانی میں برتا جانے والا ہر لفظ اپنے اندر جہانِ معنی رکھتا ہے۔ان کی کہانیاں بالعموم مختصر ہوتی ہیں، جو افسانے کی تعریف پر بھی پورے طور پر کھرے اترتے ہیں، لیکن معانی ومفاہیم کی ایک وسیع کائنات ان کے یہاں ملتی ہے۔لمبے چوڑے پس منظر کو اکثر وہ ایک یا دو جملے میں پیش کر دینے کے ہنر سے وہ متصف ہیں۔دراصل یہ کوزے میں سمندر کو سمونے کا فن ہے جو فنِ شاعری کا وصف ہے۔ان کے افسانوں سے چند جملے ملاحظہ ہوں جن سے کہانی یا کردار کا پورا پس منظر روشن ہو جاتا ہے۔

**Dr. Md. Waliullah**
Assistant Teacher (Urdu)
Uchcha Madhyamik
Rustampur, Hayaghat
Darbhanga (Bihar)
Mob.- 83404 51797





انظار الحق انصاری

# مشتاق احمد یوسفی کی تصانیف کا مختصر تعارفی تجزیاتی مطالعہ

(۴؍ستمبر ۱۹۲۳ء تا ۲۰ جون ۲۰۱۸ء)

۲۰؍جون ۲۰۱۸ء کو ۹۴ سال کی عمر میں مشہور و معروف طنز و مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کا کراچی، پاکستان میں انتقال ہوا۔اس حادثے سے اردو ادب خاص طور سے صنف طنز و مزاح کا بڑا خسارہ ہوا۔مشتاق احمد یوسفی ۴؍ستمبر ۱۹۲۳ء کو جے پور (راجستھان) میں ایک تعلیم یافتہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ان کے والد عبدالکریم خان جے پور قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر تھے۔یوسفی نے جے پور میں ابتدائی تعلیم مکمل کی اور بی.اے. کرنے کے بعد آگرہ یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم.اے. کیا اور اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وکالت کی ڈگری حاصل کی۔تقسیم ملک کے بعد یوسفی پاکستان (کراچی) چلے گئے۔۱۹۵۰ء میں مسلم کمرشیل بینک میں ڈپٹی جنرل مینجر کے عہدے پر فائز ہوئے۔۱۹۶۵ء میں الائڈ بینک میں بحیثیت مینیجنگ ڈائرکٹر، ۱۹۷۴ء میں یونائیٹڈ بینک کے صدر اور ۱۹۷۷ء میں پاکستان بینکنگ کونسل کے صدر منتخب ہوئے۔تقریباً ۱۱؍سال (۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۰ء تک) یوسفی کا قیام لندن میں رہا۔بینکنگ میں ان کی خدمات پر انہیں قائد اعظم ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔۱۹۸۲ء میں انہوں نے حج کا فریضہ بھی ادا کیا۔

انگریزی میں طنزیہ مزاحیہ ادب کا آغاز جیفرے چارسر کی شاعری سے چودہویں صدی کے آخر میں ہوتا ہے۔انہوں نے Counter Bury Tales اور Trylos and Crysedy جیسی اعلیٰ درجے کی نظمیں تخلیق کر کے انگریزی میں مزاحیہ ادب کی بنیاد رکھی۔بعد میں اس صنف میں لکھنے والوں میں ولیم شیکسپیئر، تھامس نیس، بن جانسن، سمویل بٹلر، سوئفٹ، جوزف ایڈیسن اور بیسویں صدی میں سب سے اہم نام ''مارک ٹوئن'' کا ہے۔

انگریزی کی طرح اردو مزاحیہ ادب کا آغاز بھی شاعری سے ہوتا ہے۔میر جعفر زٹلی ۱۶۵۹ء تا ۱۷۴۱ء اردو کے پہلے مزاحیہ شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔لیکن طنز و مزاح کو ادبی رتبہ اور فنی مرتبہ غالبؔ کے مکاتیب کے بعد ہی حاصل ہوا۔بعد میں فرحت اللہ بیگ، کنہیا لال کپور، مشتاق احمد یوسفی نے اردو طنز و مزاح نگاری کو جدید طرز اور نئے لب و لہجے سے ہم کنار کر کے اسے اہمیت اور اعتبار بخشا۔اردو مزاحیہ ادب کے



CamScanner

پورے پس منظر میں فکر وفن اور زبان واسلوب گویا ہر اعتبار سے مشتاق احمد یوسفی کے یہاں ایک امتیازی شان اور انفرادیت ملتی ہے۔ اسلوب میں ان خصوصیات اور صفات کا اشتراک ملتا ہے جو ہمیں اردو کے مزاح نگاروں وطنز نگاروں کے یہاں جزوی طور پر علیحدہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یوسفی کا فن اور اسلوب عام فکر، عام سطح اور عام مذاق سے بہت بلند ہے۔ ابن اسماعیل نے ان کی فنّی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''مشتاق احمد یوسفی کو اگر میں نے نہیں پڑھا تو شاید میں رشید احمد صدیقی اور
> پطرس بخاری ہی کو جدید اردو مزاحیہ ادب کا سرخیل سمجھنے کی غلطی کر بیٹھتا۔ یوسفی
> ہمارے مزاحیہ ادب کے پورے ورثے کے امین اور ہمارے سارے ذخیرہ
> نثری ادب کی عزت وآبرو ہیں۔'' ۱

ابن انشاء اور ڈاکٹر ظہیر فتح پوری نے مزاحیہ ادب کے موجودہ دور کو عہد یوسفی کا نام دیا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی اب تک پانچ تصانیف بالترتیب منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ا. چراغ تلے (۱۹۶۱ء)، ۲. خاکم بدہن (۱۹۶۹ء)، ۳. زرگزشت (۱۹۷۶ء)، ۴. آب گم (۱۹۹۰ء)، شام شہر یاراں (۲۰۱۴ء)۔ ان تصانیف کے حوالے سے انہیں کئی اہم اعزازات سے نوازہ جا چکا ہے، جن میں کمال فن ایوارڈ، آدم جی ایوارڈ، بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ، ستارہ امتیاز اور ہلال امتیاز خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

ساخت کے اعتبار سے اوّل الذکر دونوں کتابیں ''چراغ تلے'' اور خ ''خاکم بدہن'' ان کے مختلف انشائیوں کے مجموعے ہیں۔ پہلی تصنیف ''چراغ تلے'' میں ''پڑئے گر بیمار''، ''کافی''، ''یادش بخیر''، ''موذی''، ''جنون لطیفہ''، ''چارپائی''، ''کلچر''، ''اور آنا گھر میں مرغیوں کا''، ''کرکٹ''، ''صنف لاغر''، ''موسموں کا شہر'' اور ''کاغذی ہے پیرہن'' کے عنوانات سے بارہ انشائیے شامل ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے ہمیں یوسفی کی تحریری صفات، فنی خصوصیات اور تکنیکی خوبیوں کا علم ہوتا ہے اور قاری کو ان کے میلان و رجحان سے واقفیت بھی ہوتی ہے۔ ''چراغ تلے'' کی فنّی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ابن اسماعیل نے لکھا ہے کہ:

> ''ہر مضمون اپنی جگہ ایک مزاح پارہ ہے۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے میں
> مزاح کی ایک ایک کائنات متحرک ہے۔'' ۲

''چراغ تلے'' کا پہلا انشائیہ ''پڑئے گر بیمار'' کے عنوان سے ہے۔ انہوں نے اپنے پہلے انشائیہ میں ہی اکبرالہ آبادی کے ایک شعر کے مشہور مصرعے ''سب کچھ دے رکھا ہے اللہ نے شوہر کے سوا'' کے مقام پر ''سب کچھ دے رکھا ہے اللہ نے صحت کے سوا''، کی تحریف کر کے مزاح پیدا کیا ہے۔ اس مجموعہ کا آخری انشائیہ ''نقشِ فریادی'' کے عنوان سے ہے۔ انہوں نے اس انشائیہ میں لکھا ہے کہ: ''اختصار ظرافت



CamScanner



اور زنانہ کپڑوں کی جان ہے''۔

مشتاق احمد یوسفی کا دوسرا مجموعہ ''خاکم بدہن'' ۲۴/ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو شائع ہوا۔ اس میں شامل ''دست زلیخا'' کے نام سے ایک دیباچہ کے علاوہ ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہل اسٹیشن، ہائی فوکل کلب، چند تصویر بتاں وغیرہ کے عنوان سے آٹھ انشائیے اور خاکے موجود ہیں۔ اس کتاب میں طنز ومزاح کا خوب صورت امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے جس میں تفریح طبع کے ساتھ ساتھ اصلاحی جذبے کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ یوسفی نے یہاں الفاظ کے انتخاب، جملوں کی ساخت اور نوک پلک درست کرنے پر خصوصی توجہ صرف کی ہے، یہی سبب ہے کہ ''خاکم بدہن'' کے انشائیوں میں طوالت کے باوجود ابتدا سے آخر تک دلچسپی اور شگفتگی کی تاثیر برقرار رہتی ہے۔ ''خاکم بدہن'' میں شامل ''دیباچہ'' کی ابتدا بابائے انگریزی ڈاکٹر سموئل جانسن کے اس پُرمزاح فقرے سے کی گئی ہے۔

> ''جو شخص روپئے کے علاوہ کسی جذبے کے تحت کتاب لکھتا ہے اس سے بڑا
> احمق روئے زمین پر کوئی نہیں۔'' ۳

یوسفی کا انشائیہ پُرلطف انداز میں شروع ہو کر المیہ پر ختم ہوتا ہے۔ ایسے انشائیہ کو ہم ''خاکم بدہن'' کا منتخب انشائیہ کہہ سکتے ہیں۔

یوسفی کی تیسری کتاب ''زرگزشت'' ہے۔ اس کتاب میں یوسفی کے بینکنگ کیرئر کے چھ سات برسوں کی داستان ہے جسے یوسفی نے مختلف ذیلی عنوانات کے تحت اپنی ملازمت پیشہ زندگی کو نہایت ہی دلچسپی اور ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے جس میں ''تزک یوسفی'' کے نام سے مقدمہ کے علاوہ سبق یہ تھا پہلا کتاب ریا کا، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر، کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا، علم دریاؤ، پروٹوکول، فینی ڈارلنگ، کوئی قلزم کوئی دریا کوئی قطرہ، مدد دے، جانا ہمارا کاک ٹیل پارٹی میں وغیرہ ذیلی عنوانات شامل ہیں۔ اس کتاب میں یوسفی کا ظرافتی رنگ زیادہ دلکش اور نکھرا ہوا ہے۔ ان کی زبان میں سادگی، روانی اور سلاست ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تاثیر ہے جس کا اثر شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ یوسفی نے الفاظ کے استعمال میں فنی مہارت، نادر تشبیہات اور زور بیان کی قوت سے اس کے دامن کو زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ ابن اسماعیل نے ''زرگزشت'' کی فنی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

> ''درگزشت ایک ایسا مزاحیہ شاہکار ہے جو کسی بے جوڑ زنجیر کی طرح ہے۔
> آغاز سے انتہا تک ایک ایسا شاہپارہ ہے جو سطروں کی زنجیروں میں قاری کو
> جکڑ لینے کی بے پناہ قوت اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یوسفی نے اس میں
> لفظوں کے کھیل کا جادو جگا کر اپنے فرش کو عرش کی بلندیوں تک پہنچا کر دم لیا

ISSN : 2582 - 3612

ہے۔'' [۴]

یوسفی کی چوتھی کتاب ''آب گُم'' ۱۹۹۰ء میں کراچی، پاکستان سے منظر عام پر آئی۔ یوسفی کا فن ''چراغ تلے''، ''خام بدہن'' اور ''زرگزشت'' کے بعد ''آب گم'' تک آتے آتے معراج تک پہنچ گیا ہے جس کی وجہ سے ہر قدم پر ''آب گم'' میں شعور کی پختگی، فنی ضبط اور بالغ نظری کا احساس ہوتا ہے۔ اس کتاب میں انسان دوستی کی مثال، سانحاتی مزاح کا بیان اور ناسٹلجیائی کیفیت کا اظہار بڑے لطیف اور فن کارانہ طور پر کیا گیا ہے۔ مصنف نے معاشرے پر تنقیدی نظر ڈال کر ایک ذمہ دار ادیب ہونے کا فریضہ ادا کیا ہے۔ ''آب گم'' کے مطالعے سے مصنف کے ادبی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی شعور کا علم اور ان سے گہری وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔

''آب گم'' پانچ ابواب پر مشتمل ہونے کے ساتھ ہی بہت سے ذیلی عنوانات کے تحت چار سو سے زاید صفحات پر محیط ہے، جس میں پیش لفظ، غنودیم غنودیم کے علاوہ حویلی، اسکول ماسٹر کا خواب، کابلی والا، اور اللہ دین بے چراغ، شہر دو قصہ وغیرہ شامل ہیں۔ مصنف نے اپنے دو رفیقوں منور حسین اور میاں احسان الٰہی کی یادوں کو ''آب گُم'' میں ۱۱ سال میں تحریر کیا۔ ''آب گُم'' کے متعلق خود مصنف نے اسے پانچ کہانی نما خاکے کا نام دیا ہے۔ یوسفی نے ''آب گُم'' کے کرداروں کی حرکات و افعال کے پس منظر میں تقسیم وطن کے واقعے، ہجرت کے المیے، اس سے پیدا ہونے والی صورت حال اور محرومی کے احساس کو بڑی چابکدستی اور فنکاری سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ پرفیسر محمد حسن نے ''آب گُم'' کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''آب گُم میں بڑی چالاکی اور چابکدستی سے ۱۹۴۷ء کے تہذیبی المیے کے
> اس سارے الٹ پھیر کو پانچ مضامین اور پانچ کرداروں کے وسیلے سے سمیٹنے
> کی کوشش کی ہے اور اس طرح اس کے از اوّل تا آخر پڑھنے والوں کے لبوں
> پر قہقہہ، آنکھوں میں آنسو اور دل میں دھڑک رہے کہ یوسفی سیدھی راہ چلتے
> چلتے نہ جانے کس موڑ مڑ جائیں۔'' [۵]

''آب گُم'' کا پہلا باب ''حویلی'' کے عنوان سے ہے جس میں بشارت علی فاروقی کے خسر کے خاکے کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب کو یوسفی نے ''اسکول ماسٹر کا خواب'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس میں بشارت فاروقی کے گھوڑا پالنے کے شوق کا بیان ہوا ہے۔ تیسرے باب میں ''کار کابلی والا اور اللہ دین بے چراغ'' کی کہانی ہے۔ اس میں بشارت فاروقی ایک انگریگزی بیوہ سے اس کی کار خرید لیتے ہیں، اس کا بیان ہے ساتھ ہی اس میں ثقافتی اور تہذیبی پہلو بھی شامل ہیں، جس میں پاکستانی معاشرے میں ہو رہی دھاندلیوں، صحافت کی بدعنوانیوں، قانون کی پیچیدگیوں اور پولس کی بے ایمانیوں وغیرہ کو موضوع بنایا گیا



CamScanner



ہے۔ چوتھے باب ''شہر دو قصہ'' میں بیان ہونے والی کہانی میں ناسٹلجیا کے متعلق اپنے تصورات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ''آب گُم'' کا پانچواں اور آخری باب ''دھیرج کا پہلا مشاعرہ'' کے نام سے ہے۔ اس کہانی کا تعلق دھیرج گنج نام کی سرزمین سے ہے۔ دھیرج گنج لکھنؤ اور کانپور کے درمیان چھوٹی سی بستی ہے۔ یہ کہانی دھیرج گنج میں ایک مشاعرے کا انعقاد اور اس کے ہنگاموں کے علاوہ بشارت کا اسکول ماسٹر کے لئے انٹرویو، تقرری اور ملازمت پیشہ زندگی سے موسوم ہے۔ ''آب گُم'' میں جن واقعات کا بیان ہوا ہے مجموعی طور پر ان میں انتشار کے باوجود ایک ربط ہے۔ جتنے بھی کردار اس میں پیش کئے گئے ہیں وہ اندر سے کھوکھلے شکستہ اور ناسٹلجیا کے شکار ہیں۔ یہی ''آب گُم'' کا مرکزی خیال ہے۔ ڈاکٹر ظہیر فتح پوری نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے۔ ''خاکم بدہن'' اردو کی زندہ رہنے والی کتابوں میں سے ہے۔ ہم اردو مزاح کے عہد یوسفی میں جی رہے ہیں۔

یوسفی کی پانچویں اور آخری کتاب ''شامِ شہر یاراں'' ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب ان کے مضامین اور بعض تقریروں کا مجموعہ ہے۔ ساتھ ہی پرانی کتابوں کے ڈھیروں اقتباسات درج ہیں۔ ''شامِ شہر یاراں'' یوسفی کے مانوس اسلوب پر کھرا انہیں اترتی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی تحریریں اردو طنزیہ مزاحیہ ادب کے محدود سرمائے میں ایک الگ شناخت رکھتی ہیں۔ بعض ناقدین نے یوسفی کے اسلوب کو پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی کے اسلوب سے متاثر بتایا ہے۔ یوسفی کی فنی خوبیوں کے بارے میں پروفیسر محمد حسن نے لکھا ہے کہ:

> ''اردو نثر کو جو تہہ داری، بلاغت، دردمندی اور کیفیت آفرینی کی قوت یوسفی کی
> تحریروں سے ملی اس کی نظیر کم سے کم اردو کی ادبی تاریخ میں موجود نہیں۔'' [۶]

''آب گُم'' کے ۲۵ برس بعد بھی یوسفی کا انداز بیان سادہ، سلیس اور صحت مند ہے۔ وہ آسان لکھنے کی مشکلوں سے واقف ہیں۔ ان کے مزاح میں شگفتگی و تازگی کے ساتھ ساتھ بالغ نظری اور فنی پختگی کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے۔ یوسفی کے تحریروں کا مطالعہ کرنے والا اکثر کھو جاتا ہے اور اس وقت چونکتا ہے جب اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرات ٹپک کر کتاب کے صفحات پر گرنے لگتے ہیں۔ یوسفی کو ہنسانے اور رلانے کے فن پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ پروفیسر نورالحسن نقوی کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''یوسفی کی تحریروں کا مطالعہ کرنے والا پڑھتے پڑھتے سوچنے لگتا ہے اور ہنستے
> ہنستے اچانک چپ ہو جاتا ہے۔ اکثر اس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔'' [۷]

مشتاق احمد یوسفی کے یہاں اور بھی کئی فنّی خصوصیات دیکھنے کو ملتی ہیں، مثلاً برجستگی، بے تکلفی، تاریخی شعور، تکرار، کرداروں کی نفسیات کا مطالعہ سانحاتی مزاح، ناسٹلجیا، دردمندی، انسان دوستی، دوسری

ISSN : 2582 - 3612

زبانوں کے الفاظ کا استعمال، اشعار ومصرعوں کا برمحل استعمال، منظر نگاری، تحریف نگاری، نادر تشبیہات و استعارات کا استعمال، جزیات نگاری، لن ترانی، کہاوتوں کا استعمال اور Grotesque وغیرہ ایسی فنّی خصوصیات ہیں جو صرف یوسفی کے اسلوب کا خاصہ ہیں۔

اردو کے تمام ممتاز نقاد جیسے آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، اسلوب احمد انصاری، قمر رئیس اور محمد حسن وغیرہ نے متفقہ طور پر مشتاق احمد یوسفی کو صفِ اوّل کا مزاح نگار تسلیم کیا ہے۔ ابن انشاء اور ڈاکٹر ظہیر فتح پوری وغیرہ نے موجودہ مزاحیہ ادب کو مشتاق احمد یوسفی کے عہد کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

### حواشی

۱۔ مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات، ڈاکٹر محمد طاہر، ص۔۲۱۴
۲۔ اردو طنز ومزاح احتساب وانتخاب، ابن اسماعیل، ص۔۴۷
۳۔ خاکم بدہن، مشتاق احمد یوسفی، ص۔۵
۴۔ اردو طنز ومزاح احتساب وانتخاب، ابن اسماعیل، ص۔۸۴
۵۔ مشتاق احمد یوسفی (ست رنگے لمحوں کا تاجدار محمد حسن)، مظہر احمد، ص۔۱۳۴
۶۔ مشتاق احمد یوسفی (ست رنگے لمحوں کا تاجدار محمد حسن)، مظہر احمد، ص۔۱۳۱
۷۔ مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات، ڈاکٹر محمد طاہر، ص۔۱۱۸

**Anzarul Haque Ansari**
S. R. F.
Department of Urdu
Ranchi University
Ranchi (Jharkhand)
Mob.- 91100 78808



CamScanner



حنا تبسم

# ڈاکٹر کلیم عاجزؔ اور ان کی مکتوب نگاری

مکتوب نگاری کا فن زمانہ قدیم سے رائج ہے اور ابھی بھی اس فن میں جان باقی ہے۔ ویسے اس کی رفتار دھیمی ضرور ہوگئی ہے لیکن اس فن کو لوگ بھلا نہیں پائے ہیں۔ مکتوب نگاری کے فن میں ماہر ایک سے ایک ادیب پیدا ہوئے جنہوں نے اس فن کو بام عروج پر پہنچایا جن کے نمونے آج بھی کتابوں میں ملتے ہیں۔ مرزا غالب اور مولانا ابوالکلام آزاد کو مکتوب نگاری کے فن میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی نثر اتنی رواں اور شستہ ہے کہ انہیں پڑھ کر لطف حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے ان پر ہی مکتوب نگاری کا فن ختم ہوگیا ہے۔ اگر ہم عہد گزشتہ کی طرف جھانکتے ہیں تو اور بھی فنکار اس فن میں ماہر نظر آتے ہیں۔ حالیہ دور کے مکتوب نگاروں میں ڈاکٹر کلیم عاجز کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر کلیم عاجز پٹنہ کالج کے اردو زبان کے استاد کے علاوہ ایک مشہور شاعر، ادیب اور مضمون نگار تھے۔ شاعری کے علاوہ نثر بھی وہ بہت اچھی لکھتے تھے۔ ان کی نثر میں کچھ ایسی بات ہوتی تھی کہ جسے پڑھ کر دل پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا'' جب ۱۹۷۵ء میں اشاعت پذیر ہوا تو اس میں شاعری کے علاوہ ابتدا میں انہوں نے جو نثر لکھی ہے اور تلہاڑا جو کہ ان کا آبائی گاؤں ہے، میں ہونے والے فسادات کا ذکر کیا ہے اس کو پڑھ کر دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے اور آنکھوں میں نمی کے باعث حروف دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ اسی واقعے کو انہوں نے تفصیل سے اپنی کتاب ''جہاں خوشبو ہی خوشبو'' میں درج کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس میں بھی کلیم عاجز کی نثر نے ایک سماں باندھ دیا ہے جسے پڑھ کر ہر ایک قاری بے چین ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ اس کے علاوہ ان کی اور بھی بہت سی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ یہاں تک کہ ان کے خطوط پر مشتمل دو مجموعے ''دیوانے دو'' اور ''پہلو نہ دکھے گا'' بھی منظر عام پر آئے جن کا ذکر ہی ہمیں اس مضمون میں مقصود ہے۔ ان مجموعوں کی تفصیلات نیچے درج کی جارہی ہیں۔

دیوانے دو:۔ کلیم عاجزؔ کے خطوط کا یہ مجموعہ ۱۹۹۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں کُل ساٹھ خطوط شامل ہیں، ۵۷ اردو میں اور ۳ انگریزی میں۔ ''دیوانے دو'' کلیم عاجز کا وہ مجموعۂ خطوط ہے جس میں

ISSN : 2582 - 3612

ان کے ساٹھ خطوط (۵۷ اردو اور ۳ انگریزی زبان میں) کے علاوہ مکتوب الیہ ڈاکٹر جگن ناتھ کوشل، سابق گورنر، بہار و سابق وزیر قانون، حکومت ہند کے خطوط بھی شامل ہیں جو کہ انگریزی زبان میں تحریر کردہ ہیں۔

زیر نظر مجموعے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کے اکثر خطوط دونوں فریقین کے تحریری عکس کی شکل میں شائع کئے گئے ہیں۔ انہیں کمپوز یا ٹائپ کروا کر نہیں طبع کیا گیا ہے تا کہ ایک پختہ سند بھی رہے۔ ان خطوط کے مطالعے سے دونوں فریقین کے آپسی تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دو مختلف مذہب اور نظریے سے تعلق رکھنے والے بھی کس قدر ایک دوسرے سے قریب تھے۔ بظاہر مختلف مذاہب، ثقافت، زبان اور جغرافیائی خطے سے تعلق رکھنے والے ان حضرات کے درمیان کافی بعد دکھائی دیتا ہے۔ ایک قلم کا سپاہی تو دوسرا بارسوخ بلند قامت سیاست داں، ایک درویش تو دوسرا شاہ، ایک قلندر تو دوسرا تونگر لیکن اس تفاوت اور بعد کے باوجود ان میں رفاقت کی بنیادی وجہ اردو زبان و ادب، فنون لطیفہ، انسانیت اور وطن سے عشق ہے۔ دونوں انسانی قدروں کے حامل ہیں اور ان کے مزاج میں انسان دوستی، بھائی چارگی، اخوت، رواداری، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، حب الوطنی، دوسروں کے کام آنا اور ان کے مسائل کو حل کرنے کی کاوش کرنا اور مقدور بھر ان کی مدد کرنا مشترک رہا ہے اور ان کا یہی خلوص انہیں ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ خود کلیم عاجزؔ نے اس رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے :

> ''میں بہاری، وہ پنجابی، میں ایک معمولی شہری، وہ صوبے کے گورنر، میں مسلمان، وہ غیر مسلم، ایک دوسرے سے ناواقف، اجنبی، ناآشنا، ایک نقطہ پر دونوں اتفاق سے مل گئے۔ اس نقطہ کا نام اردو اور پھر یہ ثابت ہوا کہ اسی نقطے میں ہم دونوں کی شناخت پوشیدہ تھی، اس مقام اتصال پر پہنچتے ہی دونوں کی ایسی کیفیت ہوئی جیسے ہم دونوں خدا جانے کب کے دل آشنا، جگر آشنا، زبان آشنا، مزاج آشنا، دنیا آشنا اور عاقبت آشنا ہیں۔'' [۱]

یوں تو ان کے خطوط نجی ہیں لیکن ان میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی بھی ملتی ہے۔

اس مجموعۂ خطوط پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر مظفر عالم نے کچھ اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

> ''......'دیوانے دو' میں جہاں روزمرہ کے حوادث کا تذکرہ ہے وہیں شب و روز کے واقعات اور داستان پارینہ بھی۔ اگر ایک طرف طمانیت قلب کی باتیں ہیں تو دوسری طرف خلجانی کیفیت کا احاطہ بھی۔ جہاں سماجی، معاشرتی اور اخلاقی انحطاط پر آنسو بہائے گئے ہیں وہیں انسانی جذبات اور ذاتی زندگی



CamScanner



> کے تجربات بیان کئے گئے ہیں۔ جہاں ملک میں سیاسی بزم آرائی کا تذکرہ ہے وہیں انسانی قدروں کی پامالی کا رونا بھی رویا گیا ہے۔'' [۲]

اس طرح کلیم عاجز کے خطوط کا یہ مجموعہ گنگا جمنی تہذیب کا بھی ضامن ہے اور بنا مذہب اور ملّت کی دوری کے ہمارے درمیان جو تعلقات ہیں ہم آہنگی ہے اسے دکھاتا ہے۔

پہلو نہ دکھے گا:۔ کلیم عاجزؔ کے ۶۹ خطوط کا یہ دوسرا مجموعہ ہے۔ ۳۰۰ صفحاتؔ پر مشتمل یہ مجموعۂ خطوط خدا بخش اورئینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔ یہ خطوط کلیم عاجزؔ نے ۱۹۷۱ء سے ۲۰۰۱ء کے مابین اپنی بھانجی ریحانہ کو ارسال کئے تھے جو بدیس میں رہتی ہے۔ ہر چند کہ یہ خطوط ذاتی ہیں لیکن ان میں خلوص و محبت، انسیت و مروت، ایثار و ہمدردی، درس و عبرت، ترغیب و تلقین کے ساتھ ماضی کے تلخ تجربات و حوادث اور عصر حاضر کی سیاسی و سماجی صداقتیں بھی پنہاں ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی حیثیت تاریخی اور دستاویزی ہو جاتی ہے۔

کلیم عاجزؔ نے یہ خطوط انتہائی سادہ اور شیریں زبان میں لکھے ہیں اور زندگی اور اس کی کشاکش سے متعلق سیدھی، سادی، سچی، کھری اور چشم کشا باتیں اس عمدگی سے بیان کی ہیں جو انسان کو ایک باوقار، باعزّت، محترم اور معظم زندگی گزارنے کا سلیقہ بخش سکتی ہیں۔ ''پہلو نہ دکھے گا'' کے خطوط پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر ابوالحیات نے بجا فرمایا ہے:

> ''کلیم عاجزؔ کے ان خطوط کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں صرف ان کا منفرد فن اور ذاتی احوال و کوائف ہی مذکور نہیں ہیں بلکہ ایک پورا عہد اور اس کی پوری تاریخ آ گئی ہے۔ یہ خطوط ان کی شخصیت کا عکس محض نہیں بلکہ ان میں ایک زمانہ کروٹیں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ زمانے کے بدلتے ہوئے اقدار اور ان بدلتے اقدار کے سبب انسانی زندگی، ذہن، سوچ اور طرز رہائش، رفتار و گفتار نیز اطوار میں جو تبدیلیاں آ چکی ہیں یا آنے والی ہیں، ان کے اندیشے کا اظہار بھی ملتا ہے۔ وہ رو بہ زوال انسانیت کے احساس سے ہمہ دم فکر مند اور بے چین نظر آتے ہیں۔ وہ بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار کی تعمیر پر زور دیتے ہیں۔ کلیم عاجزؔ کا کمالِ فن یہی ہے کہ نجی حیثیت کے یہ خطوط بے حد ذاتی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی شعور و وجدان سے بھی مخاطب ہوتے ہیں اور یوں ان کا تعلق صرف مکتوب الیہ کی زندگی سے ہی نہیں بلکہ عام انسانی زندگی سے بھی مربوط ہو جاتا ہے۔'' [۳]

ISSN : 2582 - 3612

کلیم عاجزؔ کے خطوط، ان کے افکار و خیالات کا سچّا اور شفّاف آئینہ ہیں جو ان کے فکر و فن کے نئے نئے نکات و جہات کو کھولنے میں نو آموز محققین کے لئے یقیناً بیش بہا قیمتی سرمایہ ثابت ہوں گے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شاعری، افسانہ نگاری اور مضمون نگاری کے علاوہ اردو ادب میں مکتوب نگاری کو بھی اہم مقام حاصل ہے۔لیکن اب مکتوب نگاری اپنی ارتقائی منزل پر پہنچ چکی ہے اور یہاں پہنچ کر وہ ٹھہر گئی ہے۔اسی لئے اب وہ صرف کتابوں میں ہی رہ گئی ہے۔ چونکہ اب موبائل کا زمانہ آ گیا ہے اور لوگ خط لکھنے کے بجائے موبائل سے ہی کام چلا لیتے ہیں۔اب خط لکھنا کون چاہتا ہے چونکہ زمانہ ترقی پذیر ہو گیا ہے۔اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اب مکتوب نگاری کا دور ختم ہو گیا ہے۔لیکن ابھی وہ ختم کہاں ہوا ہے بس اس کی شکل بدل گئی ہے۔ پہلے خطوط دامنِ قرطاس پر لکھے جاتے تھے اب وہی چیٹ کی شکل میں موبائل اسکرین پر لکھے جاتے ہیں۔ ہم اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ کوئی بھی ادب یا فن ختم نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کی شکل صرف بدل جاتی ہے۔

**Hena Tabassum**
Research Scholar
Department of Urdu
Ranchi University
Ranchi (Jharkhand)
Mob.- 79038 73598



CamScanner



محمد مردان

# منظور وقار: بحیثیت طنز و مزاح نگار

سرزمین گلبرگہ علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ جہاں سے اُردو زبان ادب کے بہت سے ادبا و شعراء نے جنم لیا۔ جہاں بہت سے بزرگانِ دین کا مرکز رہا ہے۔ وہیں طنز و مزاح کے میدان میں بھی بہت سی شخصیات کا مسکن رہا ہے۔جن میں ایک عظیم المرتب شخصیت طنز و مزاح کی حیثیت سے پہچانے جانے والی منظور وقار کی ہے ۔ انکی پیدائیش 25/ڈسمبر 1953ء شہر گلبرگہ میں ہوئی ۔ ان کا پہلا مجموعہ "ہنسنا منع ہے 1990ء میں ادارہ روزنامہ بہمنی نیوز گلبرگہ کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ جسے بہت سے لوگوں نے پڑھا اور اسے پذیرائی بھی حاصل ہوئی۔

طنز و مزاح کا عالمی ترجمان ماہنامہ شگوفہ (حیدرآباد) میں انکا طنز و مزاح (انشائیہ) معذوروں کا سال 1980ء میں شائع ہوا اس کے بعد بے شمار طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور انشائیے بشمول شگوفہ قومی اور بین الاقوامی ادبی رسائل اور اخبارات میں شائع ہوئے آج بھی انکے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے اشاعت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ جون 2019ء میں ماہنامہ شگوفہ (حیدرآباد) میں منظور وقار کا خصوصی گوشہ شائع ہوا تو اسے کافی پذیرائی حاصل ہوئی منظور وقار ہی وہ واحد نامور شخصیت ہیں جنہوں نے مسلسل طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھتے آرہے ہیں۔ انکا قلم رکتا ہے اور نہ تھکتا ہے منظور وقار کو دور جدید کے تیز رفتار طنز و مزاح نگاروں میں اہم مقام حاصل ہے انکے طنزیہ مضامین ہوں کہ انشائیے عوامی ذوق عوامی مزاج اور عصری حالات و واقعات کی ترجمانی کرتے ہیں بات میں بات پیدا کرنا موقع محل دیکھ کر محاوروں کا استعمال کرنا ان کے مضامین کی پہچانے "ہنسنا منع ہے" کے بعد انکے دوسرے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ مسکرانا منع ہے سال 2019ء میں کرناٹک اُردو اکاڈمی بنگلور کے زیرِ اہتمام شائع ہوا اسی سال منظور وقار کو کرناٹک اُردو اکاڈمی بنگلور نے بہترین طنز و مزاح نگاری کے لئے کرناٹک اُردو اکاڈمی ایوارڈ سے نوازا انکی تصانیف "ہنسنا منع ہے" ہو کہ "مسکرانا منع ہے" دونوں ہی کتابیں اُردو ادب کے باذوق قارئین کے علاوہ اُردو زبان کے عام قارئین میں بھی بے حد مقبول ہوئیں منظور وقار "ہنسنا منع ہے" اور "مسکرانا منع ہے" کے ذریعہ عوام کے غموں کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انسانی زندگی میں خوشی کا ماحول بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس نقطہ نظر کو منظور وقار نے اپنی

ISSN : 2582 - 3612

تحریروں میں پیش کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ کیونکہ انسان کو ہنسنے والا جانور کہا گیا ہے۔ جو دوسرے جاندار اس کیفیت سے محروم ہیں۔ چنانچہ اُردو کی سب سے پہلی داستان "سب رس" میں مزاح کے ہلکے ہلکے اشارے نظر آتے ہیں جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اُردو ادب میں طنز و مزاح نے اپنی جگہ بنالی۔ منظور وقار طنز و مزاح کے ذریعے عوام کو خوشیوں کا پیغام دینے کے ساتھ ساتھ غور و فکر کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اور طنز و مزاح کا رُخ محض اعصاب کی طرف نہیں ہوتا بلکہ پوری شخصیت کی طرف ہوتا ہے۔ انکی تحریر اُردو طنز و مزاح میں اپنے طناز بھر تیز و نشتر اور مزاح سے لباب شیرین گدگداتی لہر میں سماجی مسائل کے آیئنہ دار ہی نہیں ہوتیں بلکہ مسائل کے تحلیل ہونے کے ساتھ ساتھ حلاوت دار بھی ہوتی ہے جس سے سماج کا نقشہ بدلا جا سکتا ہے۔ اور بے جا مسائل کو قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ منظور وقار کی طنز و مزاح نگاری کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ لوگوں کو ہنسایا جائے تاکہ وہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی تلخی حیات کو بھول جائیں انکی تحریروں پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ہنسنا ہنسانا ہی ان کا مقصد نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے اصلاح کا مقصد بھی پوشیدہ نظر آتا ہے وہ اپنی تحریروں میں سماج کے اُلجھے ہوئے بہت سے مسائل پر آواز بلند کرتے ہوئے سماج کی برائیوں کے خاتمے کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں انکی تحریروں میں صرف مزاح ہی نہیں بلکہ طنزیہ نشتر بھی موجود ہے جس سے وہ سماجی و تہذیبی مسائل کا حل چاہتے ہیں اور بطور خاص مختلف سیاسی و سماجی حالات میں سدھار اصل مقصد ہے۔ انکی تحریروں میں بزلہ سنجی برجستگی ندرت خیال مناسب الفاظ کا برمحل استعمال واقعات کی تصویر کشی وغیرہ فنکارانہ طریقے سے موجود ہے۔ منظور وقار جن کو طنز و مزاح بگاری میں ہمہ جہت فنکار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کے علاوہ انھیں طنز و مزاح کا آئیکون بھی کہا گیا۔ انھوں نے اپنی تحریروں کو سادہ دلکش انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

آیئے منظور وقار کی تصانیف "ہنسنا منع ہے" اور "مسکرانا منع ہے" کے مضامین سے لیئے گئے چند اقتباسات آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں :

"بچپن کے شیطانی دور سے گزر کر جوانی کے ابتدائی حدود میں داخل ہوتے ہی ہمارا شعور پتہ نہیں بچپن میں کہاں چھپا بیٹھا تھا اچانک جاگ اُٹھا ہم اپنے آپ کو معصوم کہلوانے کی کوشش میں اپنے شعور کو جان بوجھ کر ٹال رہے تھے کہ ہمارے پڑوس کی جوان و نوجوان لڑکیاں ہم سے پردہ کرنے لگیں تو ہمیں مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ اب ہم معصوم بچہ نہیں نوجوان پٹھا بن چکے ہیں۔''

(اقتباس : قصہ سائیکل سواری کا)

"ہوا یوں کہ جب ہم میٹرک کا امتحان نقل کے بجائے عقل سے پاس کر کے



CamScanner



اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جب کالج میں داخلہ لیا تو اچانک ہمارے دماغ پر غرور و تکبر کے جراثیم کا قبضہ کمزور ملکوں میں موجود امریکی فوجیوں کی طرح ہو گیا ہمارے بال ہمارا لباس آور ہماری چال ڈھال کا انداز یکسر بدل گیا۔"

(اقتباس: سائیکل سواری کا)

"جو لوگ کسی نہ کسی وجہہ سے قدرتی دانتوں سے محروم ہو جاتے ہیں وہ بوڑھے کہلانے کے خوف سے نقلی دانت لگاتے ہیں نقلی دانت کھانے کے لئے نہیں صرف دکھانے کے لئے ہوتے ہیں ان دنوں نقلی چیزوں کا چلن اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اصلی دانتوں پر بھی ہمیں نقلی دانتوں کا گمان ہونے لگا ہے۔"

(اقتباس: داستاں دانتوں کا)

"موٹر کار بس سے چھوٹی آٹو رکشا سے قدرے بڑی ہوتی ہے چکنی چمکدار خوبصورت اور خوش رنگ کار سرکاری بس سڑک اور ٹریکٹر کے سامنے کھڑی ہوتی ہے تو لگتا ہے خوبصورت کم عمر منچلی فلمی ہیروین اپنے بے ڈول بھدی ممی (ماں) کے قریب کھڑی ہے۔"

(اقتباس: کاروں کی کارستانیاں)

"سامعین سماعت کرنے والوں کو کہا جاتا ہے لیکن ہر طرح کی باتیں سماعت کرنے والے لوگ سامعین نہیں کہلاتے جو لوگ پڑوسیوں کی خفیہ باتیں اور دوستوں کی برائیاں سماعت کرتے ہیں انہیں سامعین نہیں سازشین عرف چغل خور کہا جاتا ہے۔"

(اقتباس: سامعین کی صف آرائیاں)

منظور وقار کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تاثرات تبصروں مضامین اور واٹس ایپ کے ذریعے جائزہ لینے تعریف اور ستائش کرنے والے قلمکاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے تاہم چند قلمکاروں کے نام اس طرح ہیں۔ ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی، یوسف ناظم، مصطفےٰ کمال، مجتبیٰ حُسین، افتخار امام صدیقی، سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر طیب انصاری، ڈاکٹر جلیل تنویر، رئیس الدین رئیس، رام پرکاش راہی، ڈاکٹر عبدالحمید اکبر، وہاب عندلیپ، ڈاکٹر فہیم الدین پیرزادہ، ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی، ڈاکٹر انیس صدیقی، عزیز اللہ سرمست، ڈاکٹر چندا حُسینی اکبر، خواجہ پاشاہ انعامدار، ڈاکٹر غضنفر اقبال، ڈاکٹر رزاق اثر، ڈاکٹر محمد نواز الدین، ڈاکٹر سیفی سرونجی،

ISSN : 2582 - 3612

عبدالمتین جامی، چاند اکبر، ڈاکٹر اعظم شاہد، سراج وجیہہ، وحید واجد، عطااللہ شاہ، ڈھکن رائچوری، ڈاکٹر محبوب راہی، یعقوب بیگانہ، سلطان اختر، مظہر محی الدین، ضیا جعفر، ضیا قاضی، احمد جلیس، ملک بزمی، مشتاق سعید، ڈاکٹر شفیقہ فرحت، ڈاکٹر فوزیہ چودھری، ڈاکٹر صغریٰ عالم اور ڈاکٹر حبیب ضیاء، منظور وقار کو دور جدید کے ان طنز و مزاح نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے جن کی تحریریں برصغیر کے گوشے گوشے کے اخبارات اور میگزین میں پڑھی جاتی ہیں۔ الغرض ان کی تحریروں میں وہ کمال حسن موجود ہے جس سے ہر کوئی انکا گرویدہ ہو جاتا ہے۔

**Mohammed Mardan**
Research Scholar
Department of Urdu
Karnataka University
Dharwad (Karnataka)
Mob.- 96631 26895



CamScanner



محمد معروف عالم

# میر تقی میر کی عظمت کا راز

(شمس الرحمان فاروقی کے حوالے سے)

بلاشبہ میر تقی میر قد آور اور مستند شاعر کی حیثیت سے اردو ادب میں ایک بڑا نام ہے۔ ان کے یہاں درد والم اور تاثیر غضب کی ہے۔ ان کے کلام میں موجود تخلیقی شعور اور تخیل کی کارفرمائی و عمل داری ان کو عالمی ادب کے بڑے شعراء کی فہرست میں شامل کرتی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو کے بیشتر ناقدوں، نامور شاعروں حتی کہ تذکرہ نویسوں نے ان کی قادرالکلامی کا اعتراف کیا اور اپنے اپنے انداز میں خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کا کمال یہ بھی ہے کہ وہ معنی آفرینی کے ساتھ کیفیت پیدا کرنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔ اسی لئے ان کے کلام میں کیفیت کی صفت غالب سے کہیں زیادہ ہے۔ غالب سے زیادہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے کی وجہ سے شمس الرحمٰن فاروقی نے ''خدائے سخن'' کا سہرا ان کے سر رکھا اور غالب پر فوقیت دی ورنہ غالب مضمون آفرینی، معنی آفرینی، شورانگیز اشعار کی کثرت اور رعایت لفظی کے معاملہ میں میر سے کہیں کم نہیں۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تاحشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

خدائے سخن میر تقی میر کا شمار اردو کے بلند پایہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ اردو شاعری کے تین اہم ستون میر، غالب اور اقبال ہیں۔ ان میں بھی وہ سب سے پہلے آتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں اپنی گوناگوں صفات و خصوصیات کی وجہ سے امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ ہر دور کے چھوٹے بڑے شاعروں نے ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کے عہد تا حال مختلف افکار و خیالات، تجربات و احساسات اور سامان تعیش و تعشق کے حوالے سے زمانہ کے متلون و متنوع مزاجوں میں بے پناہ تبدیلیوں کے باوجود ان کی شاعرانہ عظمت کا سکہ برقرار ہے۔ ہر دور کے کچھ شاعروں نے ان کے اسلوب و انداز کی حتی المقدور نقل کرنے کی کوشش کی۔ کلیم عاجز، ناصر رضا کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، ابن انشا اور منیر نیازی جیسے عظیم ادبا

ISSN : 2582 - 3612

شعراء کے کلام میں باعتبار موضوع یا بلحاظ اسلوب، میر کی شاعری کے اثرات ونقوش واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں جبکہ حالی، حسرت موہانی، فانی، اثر لکھنوی، فراق گورکھپوری، اور جون ایلیا کے یہاں اتنے واضح نہیں۔

شہنشاہ تغزل میر تقی میر کا خاص میدان غزل تھا۔ جبکہ جملہ اصناف سخن میں انہوں نے بھرپور طبع آزمائی کی۔ فنکارانہ شعور، غم انگیز لے اور معقول ہم آہنگی ان کی غزل کی اساس و بنیاد کو پختہ ومضبوط بناتی ہے۔ ان کا رنگ تغزل دردمندانہ خیالات اور برجستگی کا آئینہ دار ضرور ہے مگر احساس گھٹن سے عاری ہے۔ اردو غزل کی دنیا پر ان کا دبدبہ پہلے بھی تھا، آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہنے کی امید ہے۔ بقول آئی۔ اے رچرڈ:

''کوئی بھی فن پارہ اپنی تخلیق کے سو سال بعد تک زندہ رہے تو یہ اس کی عظمت کی دلیل ہے۔''

(اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سنبل نگار، ص۔ 28)

اس نظریہ کے حوالے سے میر کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ تین صدی سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود ان کا کلام تروتازہ اور کشش کا باعث ہے اور ان کی شہرت ومقبولیت روزافزوں ہے۔ اس قول کی تائید میں رشید احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

''آج تک میر سے بے تکلف ہونے کی ہمت کسی میں نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ آج اس پرانی زبان کی بھی نقل کی جاتی ہے جس کے نمونے جہاں تہاں میر کے کلام میں ملتے ہیں لیکن اب متروک ہو چکے ہیں۔ بربنائے عقیدت کسی کے نقص کی پیروی کی جائے تو بتایئے وہ شخص کتنا بڑا ہوگا''

میر کو بھی اپنی عظمت کا احساس تھا جس کا اظہار انہوں نے جابجا اپنے اشعار میں کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ ایسی طرز بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

جہاں سے دیکھئے یک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا مرے دیوان میں

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض
اول تو میں سند ہوں، پھر یہ مری زباں ہے


CS CamScanner



سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

باتیں ہماری یاد رہیں، پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا
پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا

(کلیات میر، مولانا عبدالباری آسی، عاکف بک ڈپو، ۲۰۰۲ء)

میر کی شہرت وعظمت اہل لکھنو کے قلوب میں لکھنؤ آمد سے قبل گھر کر چکی تھی۔ شاعری کے ذریعہ صوتی فضا وماحول پیدا کرنے کا چرچہ زبان زد خاص وعام تھا۔ اسی لئے امیر یا غریب، بادشاہ یا فقیر ان کا کلام ان کی زبان سے سننے کے لئے بیتاب تھے۔ ان کی آمد سے لکھنؤ کے مشاعروں کی رونق بڑھ گئی اور شعری مجلس ومحفل میں جان پڑ گئی۔ شاید اتنی شہرت ومقبولیت اردو کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ اور یہ بھی مبنی برحقیقت ہے کہ ان کے عہد اور بعد کے باکمال وکہنہ مشق شاعروں، ناقدوں حتی کہ تذکرہ نویسوں نے ان کی قادرالکلامی وعلومرتبت کا اعتراف سنہرے اشعار میں کیا ہے اور ان کی استادی کو تسلیم کیا ہے۔ سودا نے کچھ یوں اعتراف کیا ہے۔

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

مرزا غالب فرماتے ہیں۔

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

شیخ ابراہیم ذوق فرماتے ہیں۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

ناصر کاظمی نے تو بانگ دہل اعلان کیا ہے۔

شعر ہوتے ہیں میر کے، ناصر
لفظ بس دائیں بائیں کرتا ہے

مصحفی نے صاف اعتراف کیا ہے۔

ISSN : 2582 - 3612

اے مصحفی تو اور کہاں شعر کا دعویٰ
بھپتا ہے یہ انداز سخن میر کے مونہہ پر

ناسخ رقمطراز ہیں۔

شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں
خود وہ بے بہرہ ہیں جو معتقد میر نہیں

حسرت موہانی لکھتے ہیں۔

شعر میرے بھی ہیں پر درد و لیکن حسرت
میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

اکبرالہ آبادی شکستہ الفاظ میں کہتے ہیں۔

ہم ہیں کیا چیز جواس طرز پہ جائیں اکبر
ناسخ و ذوق بھی جب چل نہ سکے میر کے ساتھ

تذکرہ نویسوں نے بھی ان کی خوبیوں کا اعتراف ذیل کے الفاظ میں کیا ہے :

''شہرہ آفاقست ۔۔۔طبش بہ مضامین تازہ وغیر مبتذل معنی پرداز ست۔''
(سراج اللغات۔خان آرزو)

''شمع انجمن عشق بازاں فروغ محفل سخن پردازاں''
(مخزن نکات۔قائم)

''شاعر پر مغز وہمہ داں۔استاد ہم چشماں''
(طبقات الشعراء۔شوق)

''شعرش چوں درچوں خوش آب وانداز سخنش بے حساب''
(تذکرہ شعرائے اردو۔میر حسن)

ناقدین کی آراء بھی اپنے اپنے انداز میں ہیں۔
محمد حسن عسکری اپنے مضمون ''مزیدار شاعر'' میں لکھتے ہیں :

''میر کو پڑھنا تو ایک اچھی خاصی جنگ ہے جو عمر بھر جاری رہتی ہے۔اس کا احساس اردو کے ہر شاعر کو رہا ہے۔''
(مجموعہ محمد حسن عسکری،محمد حسن عسکری،ص۔۳۶۲)

اسی نوع کی بات شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں :


CamScanner



''مجھے کلام میر کا سنجیدہ مطالعہ کرتے ہوئے بیس برس اور ''شعر شور انگیز'' پر کام کرتے ہوئے دس برس ہو رہے ہیں مجھے یقین نہیں ہے کہ میں اب بھی میر کو پوری طرح سمجھ چکا ہوں۔شعر شور انگیز میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جن پر دل کھول کر بحث کرنے کے باوجود مجھے ایک طرح کا احساس شکست ہی ہوا۔''
(شعر شور انگیز،جلد دوم،شمس الرحمٰن فاروقی)

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کا چاک اور گریباں کے چاک میں

اس شعر کی بابت مولانا حالی نے ایک پرلطف واقعہ درج کیا ہے جو میر کی عظمت پر دال ہے۔لکھتے ہیں :

''مولانا آزردہ کے مکان پر ان کے چند احباب،جن میں مومن اور شیفتہ بھی تھے۔ایک روز جمع تھے۔میر کا یہ شعر پڑھا گیا۔شعر کی بے انتہا تعریف ہوئی اور یہ سب کو خیال ہوا کہ اس قافیے کو ہر شخص اپنے اپنے سلیقہ اور فکر کے موافق باندھ کر دکھائے۔سب قلم دوات اور کاغذ لے کر الگ الگ بیٹھ گئے اور فکر کرنے لگے۔اسی وقت ایک اور دوست وارد ہوئے۔مولانا سے پوچھا کہ حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں؟ مولانا نے کہا ''قل ہواللہ کا جواب لکھ رہا ہوں۔''
(اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ،ڈاکٹر سنبل نگار،ص 27)

مذکورہ بالا شعر کے متعلق یہ رائے بھی ظاہر کی :

''ظاہر ہے کہ جوش جنوں میں گریباں یا دامن یا دونوں کا چاک کرنا نہایت مبتذل اور پامال مضمون ہے جس کو قدیم زمانے سے لوگ برابر باندھتے آئے ہیں۔ ایسے چیتھڑے ہوئے پامال مضمون کو میر نے باوجود غایت درجے کی سادگی کے ایک اچھوتے،نرالے اور دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے کہ اس سے بہتر اسلوب تصور میں نہیں آسکتا۔اس اسلوب میں بڑی خوبی یہی ہے کہ سیدھا سادہ ہے،نیچرل ہے اور باوجود اس کے بالکل انوکھا ہے۔''
(انتخاب کلام میر،مولوی عبدالحق،ص۔۲۳)

لفظ ومعنی کے جادوگر میر تقی میر الفاظ ومحاورات کا استعمال کر کے زبان میں موسیقی پیدا کرنے کا

ISSN : 2582 - 3612

ہنر بخوبی جانتے ہیں۔ان کی شاعری اپنے مضمون اور موضوع کے اعتبار سے پوری طرح ہم آہنگ اور لطیف جذبات و کیفیات کی عکاسی کرتی ہے۔زبان کی فصاحت، سادگی، عمدہ پیرایۂ بیان، سوز و گداز، جدت مضامین، پیکر تراشی، مانوس فارسی تراکیب، تکرار الفاظ، سہل ممتنع، الفاظ کی اہمیت، صداقت و واقعیت اور تاثیر کلام جیسی خوبیاں ان کو دوسرے اردو شاعروں سے ممتاز بناتی ہیں۔ان کا ہر شعر درد دل کی تصویر معلوم ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں آپ بیتی جگ بیتی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔یہی غم و عشق کی آفاقیت انہیں شہرت عام و بقائے دوام بخشتی ہے۔ان کی شاعری میں اسلوب دھیما اور الفاظ ملائم، سادہ اور سلیس ہوتے ہوئے بھی غیر معمولی جوش و آہنگ سے عبارت ہیں۔اردو کے تشکیلی دور کے شاعر ہونے کی وجہ سے وہ عظیم نہیں ہیں بلکہ ان میں وہ ساری صفات و کمالات بدرجۂ اتم موجود ہیں جو انہیں بڑا بناتی ہیں جیسے بیان میں تازگی و کشش، مطلب کی ادائیگی میں شگفتگی اور افکار و خیالات میں جدت و بلندی۔اور ان خصوصیات کا اعتراف تقریباً تمام نقادوں نے کیا ہے۔وہ پہلے عظیم شاعر ہیں جن کے سر پر قدیم و جدید شاعروں، تذکرہ نویسوں اور ناقدوں نے عظمت کا تاج رکھا ہے۔اردو شاعری کی تاریخ جن چار عظیم شاعروں میر تقی میر، میر انیس، مرزا غالب اور اقبال کے کلام سے مالامال ہے ان میں بھی میر کا شمار سب سے پہلے ہوتا ہے۔انہیں خدائے سخن بایں معنی سب سے بڑا شاعر اس لئے کہا گیا کہ انہوں اپنے سرمایۂ شاعری میں گذشتہ تمام بہترین شعری روایتوں سے اخذ و استفادہ کیا اور بعض نئی روایتوں کی بنیاد ڈالی۔

شمس الرحمٰن فاروقی غالب و میر کا موازنہ کر کے میر کو فوقیت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''زبان کے تنوع، تجربۂ حیات کی کثرت اور شخصیت کی ہمہ گیری میں میر کا مرتبہ غالب سے اعلی ہے خالص تعقل اور تجرید اور نازک خیالی میں غالب کا درجہ میر سے بلند ہے۔دونوں کے تخیل میں فرق ہے لیکن تخیل کی شدت دونوں کے یہاں برابر ہے یعنی دونوں بیحد مضمون آفریں ہیں۔غالب کا تخیل آسمانی اور میر کا تخیل زمینی یعنی غالب تجریدی (Abstract) زیادہ ہیں اور میر ٹھوس اور مرئی (Concrete) زیادہ ہیں۔ معنی آفرینی میں دونوں برابر ہیں۔ ہاں ایک صفت کیفیت کی میر کے یہاں ایسی ہے جو غالب کے یہاں بہت کم ہے۔میر کا کمال یہ ہے کہ معنی آفرینی کے ساتھ کیفیت پیدا کر لیتے ہیں۔شورانگیز اشعار دونوں کے یہاں کثرت سے ہیں۔ رعایت لفظی سے دونوں کو بیحد شغف ہے۔

اس مجموعی محاکمے کی روشنی میں اور اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے

R.N.I. : BIH URD/2019/78036

CS CamScanner



> کہ میر نے غالب سے زیادہ اصناف سخن کو برتا ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''خدائے سخن'' کا خطاب میر کو ہی زیب دیتا ہے۔''
>
> (شعر شور انگیز، جلد اول، شمس الرحمٰن فاروقی، ص۔ 41)

میر تقی میر تاریخ ساز کے ساتھ ساتھ عہد ساز بھی تھے کیونکہ انہوں نے ہر دور کے شاعروں کو اپنے کلام سے متاثر کیا۔یہی وجہ ہے کہ بعض شعرا نے اسلوب و انداز کی سطح پر ان کی پیروی کر کے جذباتی زبان کو ترجیح دی اور بعض نے ان کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کیا اور سخت جانفشانی کے باوجود ان کے اسلوب و انداز کی مکمل تقلید نہ کر سکے جیسے فانی بدایونی، حالی اور حسرت موہانی وغیرہ۔

خواجہ میر درد کی طرح میر کسی ایک صنف سے بندھے نہیں تھے بلکہ غزل کے علاوہ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، شہر آشوب، واسوخت اور ہجو جیسی اصناف میں ان کی شاعری کے نمونے وافر مقدار میں موجود ہیں۔واسوخت اور ایک بحر کی ایجاد کا سہرا ان ہی کے سر ہے جبکہ غالب کا عروض میں کوئی تصرف نہیں۔کثرت اصناف کے حوالے سے کوئی شاعر ان کا ہمسر نہیں حتی کہ سودا بھی، کیونکہ ان کے یہاں واسوخت نہیں ملتی اور مثنوی فن کی کسوٹی پر کھری نہیں اترتی۔لہذا ایسا شاعر جو اپنے عہد میں ممتاز رہا ہو، تین صدیاں گذر جانے کے بعد بھی اس کی شہرت و مقبولیت میں کمی کے بجائے اضافہ ہو رہا ہو اور اس کے اسلوب و انداز کی نقل و تقلید کرنے والوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہو، تو اس سے بڑھ کر اس کی عظمت کی دلیل کیا ہو سکتی ہے۔؟

بقول مولوی عبدالحق:

> ''میر تقی میر سرتاج شعرائے اردو ہیں۔ان کا کلام اس ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا جیسے سعدی کا کلام فارسی میں۔اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی ایک فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے تو میر کا نام اس فہرست میں ضرور داخل کرنا ہوگا۔''
>
> (انتخاب کلام میر، مولوی عبدالحق، مقدمہ، ص۔ ۷)

**Md. Maroof Alam**
Research Scholar
Department of Urdu
L. N. M. University
Darbhanga (Bihar)
Mob.- 95729 67338

ISSN : 2582 - 3612

محمد مزمل فاروقی

# نورالحسنین کے ناول ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' کا تنقیدی جائزہ

ادب کا رشتہ تاریخ سے بھی ہے، ادب نہ صرف معاشرتی حقائق کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اُن لمحات کو بھی قید کر دیتا ہے جنھیں تاریخ پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے۔ ہمارا ماضی کا تاریخی ادب صرف بادشاہوں، شہزادوں، ملکاؤں اور شہزادیوں ہی کے قصے سناتا ہے لیکن اُن میں عام آدمی اور عام معاشرتی زندگی کا عکس خال خال ہی نظر آتا ہے۔ حال کے ادب نے بھی تاریخ کو فراموش نہیں کیا ہے، لیکن حال کا ادب صرف حکمرانوں کے گیت نہیں گاتا بلکہ وہ اپنے عہد کی تاریخ اور حکمرانوں کے اُمورِ حکومت پر بھی روشنی ڈالتا ہے، ان کی کمزوریوں اور خامیوں کا جائزہ بھی لیتا ہے۔ انتظامیہ کی بے حسی، جبر و تشدد، بدعنوانیوں، عوامی استحصال، اقتدار کی ہوس اور اس کی خاطر اُٹھائے جانے والے غلط اقدامات پر بھی گرفت کرتا ہے۔ وہ ایک طرف ماضی کی شاندار روایتوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ہے تو دم توڑتے اقدار کا نوحہ گر بھی ہے۔ وہ کسی حاکم کا ماتحت تاریخ نویس نہیں ہوتا جس کا ایک ایک لفظ خود حاکم کا بخشا ہوا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آج کے ادیب وہ کام کر رہے ہیں جو ماضی میں شائد کبھی ہوا ہی نہیں۔

عصری آگہی کا عرفان رکھنے والے ادیبوں میں ایک نام نورالحسنین کا بھی ہے۔ افسانہ ہو یا ناول انھوں نے جب بھی قلم کو جنبش دی فن پارے کو وجود بخشا۔ اگر چہ ان کی اوّلین شناخت ایک افسانہ نگار کی ہے بلکہ اس میدان کے وہ ایک ایسے سورما ہیں جس نے دکن کی سرحدوں سے اُٹھ کر پورے برصغیر سے اپنی تنقیدی بصیرتوں کا خراج وصول کیا ہے، تو دوسری طرف تخلیقی ادب کے میدان میں بھی جدت کے نئے اُفق دریافت کیے ہیں۔ نورالحسنین کا حال ہی میں دوسرا ناول ''ایوانوں کے خوابیداہ چراغ'' شائع ہوا ہے یہ ماضی کی تاریخ بھی ہے اور معاشرہ اور تہذیب کا آئینہ بھی۔ اُردو ادب جس کا قدیم افسانوی سرمایہ داستانوں پر مشتمل ہے، جہاں حقائق سے چشم پوشی ملتی ہے اور زندگی سے فرار کی کیفیت۔ لیکن عصرِ حاضر میں فکشن سِکّہ رائج الوقت ہو گیا ہے۔ بقول گوپی چند نارنگ :

''اکیسویں صدی فکشن کی صدی ہے۔'' [۱]

ناول زندگی کا راست مخاطبہ ہے، انگریزی ادب اُردو ناول کا جنم داتا ہے، اس کی پرورش داستان

R.N.I. : BIH URD/2019/78036

CamScanner



کے آغوش میں ہوئی۔ ناول میں زندگی کے معانی اور اس کی تفسیر آئینہ تعبیر کا کام کرتی ہیں۔

مختصر یہ کہ ناول وہ نثری قصہ ہے جس میں ہماری زندگی کی تصویر ہو بہو پیش کی گئی ہو، خلاصۂ کلام یہ کہ کارگۂ حیات میں شیشہ گری کا فن اُردو ناول نگاری ہے۔ نورالحسنین نے نثر کی تمام اصناف کو نہ صرف برتا بلکہ ان کے ساتھ انصاف بھی کیا۔ اُن کی اب تک آٹھ کتابیں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں، اگر چہ اُن کا خاص میدان افسانہ نگاری ہے اور اُن کا شمار اُن افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے جدیدیت کے غبار میں ڈوبی ہوئی کہانی کو دوبارہ دریافت کیا اور افسانے کو مطالعاتی وصف سے آراستہ کیا۔ لیکن ناول نگار کی حیثیت سے بھی وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔ خصوصاً ناول کے باب میں ان کے ناول اپنے قاری کو چونکا رہے ہیں۔

تاریخی فکشن کا اوّلین مقصد صرف تاریخ بیان کرنا نہیں بلکہ اُن عام لوگوں کی زندگی کی کرب ناکیوں کو ناول کے ذریعہ اُجاگر کرنا ہے جن کو وقت کی ستم ظرفی اور مورخ نے اپنی قلم کے ذریعہ صفحۂ قرطاس پر جگہ نہ دی۔ تاریخی ناول لکھنا ایک دشوار مرحلہ ہے۔ تاریخی ناول وہی لکھ سکتا ہے جس نے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا وہ جو تاریخ کے وسیع مطالعہ سے واقف ہو۔

تاریخ کو فکشن کا موضوع بنا کر ادیب بہت بڑی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ وہ کُرید اور جستجو جو قاری کو کسی بھی کامیاب قصے میں گم ہو جانے پر مجبور کرتی ہے تاریخی موضوع میں ناپید ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ پڑھنے والا تاریخی کرداروں کے انجام سے آشنا ہوتا ہے اور مصنف کا طرزِ فکر تاریخی حقائق سے چشم پوشی اختیار نہیں کر سکتا۔ اس صورت حال میں مصنف کے ہاتھ میں صرف ایک حربہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے فنی تاثیر جو قاری کے قصے میں محو ہو جانے کا واحد سبب ہے۔ اس نکتہ کے پیش نظر نورالحسنین نے اپنے تاریخی، طبقاتی اور تہذیبی شعور اور مطالعے و مشاہدے کی وسعت کے ذریعے مذکورہ تاریخی ناول میں تابنا کی پیدا کی ہے۔ ماضی کی تہذیب، اس کا جاہ و حشم، رزم و بزم اور اس کے پس پردہ اقتدار کی دیوانی خواہشوں اور اس کی تکمیل کے حربوں کے جواز کو نورالحسنین نے نہایت فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ تاریخی حقائق کو تخیلی قوت سے آمیز کرنے کے لیے انھوں نے ایک اسلوب وضع کیا ہے جو اپنی آراستگی اور احساس کی بنا پر قاری کو نہ صرف ماضی کی محل سراؤں اور رزم گاہوں میں لا کھڑا کرتا ہے بلکہ ذہنی کچوکے بھی لگاتا ہے۔

ناول کے فنی و فکری کینوس میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ اُس میں بنیادی واقعات کے ساتھ عقائد، نظریات، توہمات، تعصّبات وغیرہ زیادہ اجمال کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ نورالحسنین نے مظاہرات فطرت کے ساتھ ذہنی کیفیات کو نہایت خوبی کے ساتھ صفحہ قرطاس پر اُتارا ہے۔ واقعات اور حادثات کی ترنگوں سے خلق کیے گئے اس ناول کے لہجے میں ایک توازن اور استحکام ہے۔ ناول نگار دراصل ماضی کے دریچوں اور واقعات سے اخذ کردہ نتائج کو اپنے زاویۂ نگاہ سے اپنی تحریروں میں پیش کرتا ہے۔ پیش کش کا انداز جتنا پُر اثر

ISSN : 2582 - 3612

اور اُن کا برتاؤ جتنا منضبط ہوتا ہے، ناول اُتنا ہی کامیاب قرار پاتا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ واقعات کی ترتیب، کہانی کی بُنت، ماحول کی پیش کش، کرداروں کے برتاؤ اور لہجے کے فطری پن کے اعتبار سے ناول ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' اپنی ایک شناخت بنانے میں کامیاب رہا ہے۔

''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' ۱۸۵۷ء جنگ آزادی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ ایسے تاریخی ناولوں میں عام افراد کی زندگی، اُن کی سوچ، اُن کی قربانیاں اور اُن کی معاشرتی رہن سہن پر روشنی نہیں پڑتی اور نا ہی کسی ایسی ناول میں عام آدمی کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس ناول میں مرکزی کردار وہ عام لوگ ہیں جو اپنے وقت کے تاریخی جبر سے دوچار ہوئے تھے جنھوں نے وقت کے اُس لمحے کو بھوگا بھی تھا، شریک بھی ہوئے تھے اور قربانیاں بھی دی تھیں، لیکن مورخ کا قلم صرف شاہانِ وقت کی افتاد کا ہی نوحہ گر رہا، عام افراد کی زندگیوں سے وہ ایک طرح سے لاتعلق ہی رہا چنانچہ اس ناول میں جو مرکزی کردار ہیں وہ اُس زمانے کے عام افراد کی نمائندگی کرتے ہیں اور تاریخی شخصیات کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں۔

نورالحسنین نے حال کے دریچوں سے ماضی کی تصویر کشی کرتے ہوئے تاریخی ناول کے مقصد کو کامیابی کے ساتھ پورا کیا ہے۔ یہ ناول فنی اعتبار سے نورالحسنین کا سب سے بہتر ناول ہے، زبان و بیان کا بھی نورالحسنین نے اس میں خاص خیال رکھا ہے۔ مکالمے چست اور درست ہیں، منظر کشی کے اعتبار سے یہ ناول اپنے عہد کا اچھا ناول قرار دیا جا سکتا ہے۔ مکالمے تاریخ کے تناظر میں پیش کیے گئے ہیں، منظر کشی اور جذبات نگاری بھی تاریخ کے تابع ہے۔ یہ سب کچھ اس ہنرمندی کے ساتھ کہ جیسے تاریخی، ثقافتی اور تہذیبی مناظر قاری کے روبرو ہیں وہ ان کا شاہد ہے۔ نورالحسنین نے انسانی زندگی کے مختلف رنگ اخلاق و کردار کی فطری کیفیتوں کو پیش کیا ہے۔

ہر جگہ خون خرابہ، درد و غم کے سبب انسان مسائل سے دوچار ہو کر تلخیوں کا شکار ہو جاتا ہے، زندگی کی کتاب کے مطالعہ اور کائنات کے مشاہدے سے اس کا احساس قوی ہو جاتا ہے۔ شعور کی یہی آگہی اسے کربناک اور دردناک دور سے گزرنے پر مجبور کرتی ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ آگہی کا شعور کربناک ہوتا ہے اور یہ اس ناول کی بنیادی تکنیک بن گئی ہے۔ ناول ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' نورالحسنین کے گہرے تاریخی، تہذیبی ادراک و شعور کا حوالہ ہے۔ تاریخی مسائل پر مضبوط گرفت، عصری حسیت، ارضیت سے جڑے رہنے کی تمنا، اعلیٰ فکری فنی ذوق، عمیق مطالعات کا رُجحان، منفرد تجربات، وسیع مشاہدوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ راقم نے پہلے بھی ان کے ناول پڑھے ہیں مگر اسلوب کا یہ جادو جو قاری کو اپنی گرفت میں اس طرح لے لیتا ہے کہ ناول ختم نہ ہو نیند نہیں آتی۔۔۔ راقم کے خیال میں کسی بھی ناول کی پہلی کامیاب پہچان یہی ہے کہ ناول اپنے آپ کو پڑھوا کر ہی چین لے۔ فکشن کی کامیابی کا راز ہی اس کے مطالعاتی وصف میں ہے۔



CS CamScanner



''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' ناول میں متعدد کردار اپنی رنگارنگ حرکات و سکنات سے ایک خاص فضاء کی تشکیل کرتے ہیں۔ قدرتِ بیان کا بہترین نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' کا ایک اور اہم پہلو ہے کبیؔر کے دوہوں، امیر خسرو کے اشعار کا استعمال، بہادر شاہ ظفؔر کے اشعار اُن کی زبانی بظاہر یہ عجیب سی بات لگتی ہے کہ ناول کے واقعاتی پیرائے میں مسلسل اور متعدد دوہوں اور اشعار کے استعمال کی کیا ضرورت آن پڑی، سرسری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہاں نثر شاعری سے اکتساب کرتی نظر آ رہی ہے مگر معاملہ کچھ اتنا سیدھا سادہ نہیں ہے۔ یہ بھی ایک شعوری عمل ہے جسے ناول نگار نے تکنیک کے طور پر استعمال کیا ہے۔

ناول کا مرکز و محور حیدر خان ہے، دو نسائی کردار تارا بائی اور چنبیلی ایک جیسے حالات سے دوچار ہے۔ پنڈت، دینا ناتھ، سلیم، نیلوفر، سبحان میاں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے ثانوی کردار بھی اس ناول کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ ناول کی عمارت چھوٹے چھوٹے واقعات اور جزئیات نگاری پر ٹکی ہوئی ہے۔ یہاں اُکتا دینے والی علامات، استعارات اور تشبیہات تو نہیں ہیں مگر ایک واقعہ سیدھا سیدھا نہیں چلتا ذہن کی کیفیت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ حسن و جمال اور خوف و ڈر کی کیفیات بدلتی رہتی ہے۔ کبھی دل کٹ کٹ کر گرنے لگتا ہے اور کبھی سمٹنے لگتا ہے اور یہ ذمہ داری جزئیات نگاری ادا کرتی ہے۔

ناول میں بے شمار کردار ہیں جو اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہیں۔ کچھ کردار ایسے ہیں جو ناول میں ازاوّل تا آخر موجود ہیں اور کچھ موقع بہ موقع آتے ہیں اور نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ مرکزی کردار حیدر خان انگریزی حکومت اور ان کی معاشرتی بگاڑ کو برداشت نہیں کر پاتا اور اس کے خاتمے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ ناول کی شروعات ایک قبرستان سے شروع ہوتی ہے جہاں پر کچھ مجاہدین انگریز پولیس سے چھپ کر قبرستان میں پناہ لیتے ہیں۔ جہاں وہ اپنے ساتھیوں کا انتظار کرتے ہیں جو ملک کے حالات کی خبر لانے گئے ہوئے ہیں۔ ناول کی شروعات حیدر خان، پنڈت اور تارا بائی سے شروع ہوتی ہے۔ ناول کا پلاٹ بے حد وسیع اور گمبھیر ہے۔ ایک غیر سنسان اور ویران قبرستان میں تینوں جمع ہیں اور آگ تاپتے بیٹھے ہیں۔ حالات حاضرہ پر گفتگو کرتے ہیں۔ ہر ایک کو ملک کے موجودہ حالات کی فکر ہوتی ہے۔ یہی سے مصنف نے ناول کا پلاٹ تیار کرنا شروع کیا۔ ناول ایک گمبھیر اور خوفناک ماحول سے شروع ہوتا ہے۔ قبرستان میں مکمل تاریکی اور سنّاٹا چھایا ہوا ہے۔ قبرستان میں موجود جھاڑیاں اور استادہ درخت بالکل خاموش کھڑے تھے جیسے کسی آنے والے طوفان سے پہلے سکوت چھا جاتا ہے۔ مصنف نے ناول کی شروعات پُراسرار ماحول سے شروع کی ہے:

سرد رات میں آگ سے جسم کو تاپتے ہوئے حالات حاضرہ پر گفتگو کرتے ہیں۔ ہر ایک کو ملک

ISSN : 2582 - 3612

میں بڑھتی ہوئی بے چینی کی فکر ہوتی ہے۔اور ہر ایک اپنے اوپر انگریزوں کے کئے گئے ظلم وستم کی داستان سناتا ہے۔اسی طرح وہ مجاہدین ہر دن دلّی کی گلیوں کوچوں میں دن گزار کر حالات کی خبر رکھ کر ہر رات قبرستان میں جمع ہو کر ایک دوسرے کو دن بھر کی روداد سناتے ہیں،اور آنے والے مجاہد دوستوں کی خبروں کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔سب سے پہلے دینا ناتھ جھانسی کی خبر لاتا ہے کہ :

''بری خبریں ہیں ۔انگریز سرکار نے دیسی والیان کے لیے الحاق کا قانون پاس کر دیا ہے۔تمام رجواڑوں میں اس قانون کے باعث سخت بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔'' ۲

اس خبر پر بحث ہوتی ہے۔سب اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں۔دوسرے باب میں سلیم اور نیلوفر کی محبت بھری شرارتیں ہے ۔تیسرے باب میں پھر وہی قبرستان کا ماحول ہے ۔وہی سرد،ویران اور خوفناک ماحول اُلّو کی آواز سنّاٹے کو چیرتی ہوئی۔دوسری خبر سبحان میاں لاتے ہیں کہ :

''ساتھیو!اب اودھ کے بارے میں کیا کہوں،وہ تو بارود کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا ہے۔کسی بھی وقت فرنگیوں کے خلاف جنگ چھڑ سکتی ہے ۔اودھ کے نواب واجد علی شاہ کو اُن کی والدہ کیساتھ کلکتہ بھیج دیا گیا ہے اور ملکہ حضرت محل نے اپنے نوعمر شہزادے برجس قدر کو اودھ کا جانشین قرار دیا ہے۔انگریزوں نے اُن کی نوابی کو تسلیم نہیں کیا۔یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پوری ریاست میں پھیل گئی عوام اور فوج حضرت محل کے ساتھ ہیں۔اور شہر کا بچہ بچہ ان فرنگیوں کے خلاف صف آرا ہے۔'' ۳

اس خبر پر بحث ہوتی ہے تبھی چنبیلی حاضر ہوتی ہے جو کہ ایک طوائف ہے اور جنوبی ہند کی خبر دیتی ہے:

''فرنگیوں نے ستارا اور ناگپور کو اپنی عملداری میں شامل کر لیا ہے۔'' ۴

اس ناول میں مصنف نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے کردار کو بہت سچائی اور حقیقت سے پیش کیا ہے۔جاہ وجلال کے ساتھ بادشاہ کی دوراندیشی اور خدشات کو ظاہر کیا ہے۔جب مرزا مغل قلعہ معلّیٰ میں داخل ہو کر کہتے ہیں :

''حضور مبارک ہو!انگریزی اقتدار کے خلاف بغاوت کا بگل بج چکا ہے۔''

''نادان شہزادے مٹھی بھر جیالے انگریز استحکام کا تختہ نہیں پلٹ سکتے!''

''آہ!یہ تو کھلی خود کشی ہے!''



CS CamScanner



''جان پدر!ہواؤں کے شور سے برسات نہیں ہوتی۔وقتی جذبات معرکے سر نہیں کرتے۔سراب دھوکا دیتے ہیں۔ہماری نظروں میں تو صحرا ہی صحرا پھیلا ہوا ہے۔'' ۵

''لیکن عزیزم!اپنے اجداد کی مانند فتوحات حاصل کرنے کے لیے اُن کی حکمت ودانائی کا پرتو بھی ضروری ہے۔اللہ تمہیں سرخرو کرے۔لیکن شہزادے یہ کبھی مت بھولنا کہ عجلت میں پہاڑ سر نہیں کرتے۔جاؤ اور وقت کا انتظار کرو۔'' ۶

اتنا دوراندیش بادشاہ ہونے کے باوجود شکست اور ناکامی کیوں کر ہوئی اس کے اسباب کیا تھے ان سب کا احاطہ مصنف نے بڑی سچائی اور ایمانداری سے کیا ہے۔اس ناول میں مصنف نے فلیش بیک اور فلیش فارورڈ تکنیک کے ساتھ کہیں کہیں شعور کی رو کا بھی استعمال کیا ہے۔ایک اہم اور دلچسپ بات وہ یہ ہے کہ اس ناول کے کرداروں کی بولی ٹھولی،مصنف کی زبان پر پکڑ ڈھیلی نہیں ہے۔ہر کردار کے زبان کا وزن کسی بھی جانب سے ڈگمگایا نہیں ہے،بلکہ یہ مصنف کا کمال ہے کہ انہوں نے ہر ایک کی زبان کو بڑی مہارت سے برتا ہے۔دلبر داد خان اور جینیفر (جینی) کا دلچسپ مکالمہ ملاحظہ ہوں:

'اوئے خانم تم بھول گئی،تم ہم کو غنڈہ بولی تھی۔''

''ہم خانم نہیں۔۔جینیفر۔۔۔جینی۔۔۔سمجھا؟''

''اوئے تم یسوع مسیح کی اُمت سے کب نکلا؟۔۔۔
اور کب جینی ہو گیا۔''

''ہم بچپن ہی سے جینی ہے۔''

''تم مہاویر جی کا ہو گئی۔؟ یہ تو بڑا گڑ بڑ ہو گئی۔''

''کون مہاویر جی۔؟''

''مہاویر جی کو نہیں جانتا پھر بھی جینی ہو گئی۔؟''

''اوئے تم ہمارے محمدﷺ صاحب کو جانتی۔؟''

''یس۔۔وہ تمھارا پروفٹ۔۔پیغمبر ہے۔''

''پھر بھی تم محمدی کے بجائے جینی ہو گئی۔؟ ۷

جب حیدر خان اور چنبیلی عزیزن بائی سے ملنے لکھنؤ جاتے ہیں تب لکھنؤ کی زبان ملاحظہ ہوں۔

''اخاہ!ہماری سرزمین پر نئے نئے معلوم ہوتے ہیں۔؟

''کہاں سے تشریف لائے ہیں حضور۔۔؟''

''کس کا شرفِ نیاز چاہتے ہیں۔؟ کچھ تو بتائیے جناب عالی۔''

''اماں یونہی ٹک ٹک دیدے پھوڑو گے یا کچھ منہ سے بھی پھوٹو گے۔؟''

''یہاں عزیزن صاحبہ رہتی۔۔!''

''اخاہ! تو آپ بھی پہلو میں حور رکھنے کے باوجود عزیزن کے زُلفِ گرہ گیر کے اسیر ہیں تو حضور سنیئے گا، وہ جو بیچتے تھے درددل کی دوا وہ تلوار اُٹھا کر میدانِ جنگ میں چل دیئے۔'' [8]

عزیزن بائی اپنے کوٹھے کی ہر چیز بیچ کر جنگ آزادی میں شامل ہوجاتی ہے۔دوسری جگہ بنارس کے دیہاتوں کی زبان ملاحظہ ہوں:

''اوئے چودھرائین! یہ کپڑا تم اپنے پاس ہی رکھّو! اے فوجی ہوویں، اُن نے کچھ نہ بولو۔''

''فوجی کا ایسے ہوویں ہیں؟ نہ جسم پر ماس نہ کھوراک برابر! اے چھوکریا مرغی برابر بھی نہ کھاوے۔'' [9]

مصنف نے کئی جگہوں پر ہندی الفاظ کا بھی سہارا لیا ہے۔دراصل ہندی زبان کے الفاظ و محاورات استعمال کر کے مصنف نے اپنے ناولوں کو عوامی پیرایہ عطا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ کسی حد تک دُرست بھی ہے کہ عوامی مسائل عوامی پیرائے میں شدید زیادہ بہتر طریقے سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔فکشن کا قاری جانتا ہے کہ زبان، بیانِ واردات یا زمانے کے ساتھ بدلتے ہوئے یہ تاثیر دیتی ہے کہ ہر عہد کی الگ زبان ہے جس سے ادبی تہذیب کا امتیاز قائم ہوتا ہے۔زبان و ادب کے دریچے ماضی کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں :

''بھائی پنڈت ،جیون سوئم ایک بڑا ناٹک مندر ہے اور سمئے اپنے انوسار منوشیہ کا پریوگ کرتا ہے اور منوشیہ جیون کُنڈ کے بھنڈار سے پاپ اور پُنیہ کے بھئے سے پرے کیا کچھ نکال لاتا ہے، یہ تو وہ بھی نہیں جانتا ہے۔'' [10]

''دینا ناتھ یہ سب نیتی کے کھیل ہیں۔وہ آگاہ بھی کرتی ہے، بچاؤ کا سادھن بھی بتاتی ہے۔یدی اُس کی اِچھا ہو تو آدمی سپھل ہوجاتا ہے اور یدی اِچھا نہ ہو تو کارن انسانوں کے سر تھوپ دیئے جاتے ہیں۔'' [11]

نورالحسنین نے اُس زمانے کے اتحاد کا نقشہ بھی پیش کیا اور ہر زمانے کے لیے اُسے ضروری قرار دیا ہے۔حیدر خان کہتا ہے :



CamScanner



''میرا یہ خاندان ہندوستان میں سب سے نیارا خاندان ہے پنڈت۔سلطان میں ہمارے بزرگ ،تارا میری بہن، دینا ناتھ میری بہن کا شوہر،تم میرے چھوٹے بھائی، ہمارے درخت کا ہر پنچھی اپنی مرضی کی عبادت کرتا ہے۔اپنی اپنی شاخ پر بیٹھتا ہے لیکن اُن کی محبتیں ایک ہے۔میرے بھائی کل تم ہی اس کے وارث ہونگے وچن دو کہ تم اس میراث کو کبھی گھن نہ لگنے دو گے۔'' [12]

نورالحسنین نے ہر طرح کے کردار کے ساتھ انصاف کیا ہے، چاہے وہ عام آدمی ہو یا مجاہدین آزادی یا پھر تاریخی کردار،تاریخی کرداروں کی تراش بہت اہمیت رکھتی ہے۔چونکہ ان کرداروں کی کیفیت واقعات و حادثات کے ساتھ اپنی نفسیات و نظریات بدلتے رہتے ہیں۔جہاں تک اس ناول میں منظر نگاری کی بات کی جائے تو نورالحسنین نے اس پر کافی محنت کی ہے۔انھوں نے جہاں تک ہو سکے حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔تاریخی ناول نگاری میں ناول نگار کی سب سے بڑی ذمہ داری ہوتی ہے تاریخی واقعات کی مستند روایات اور قاری کو اس وقت کے ماحول، عہد،تہذیب و ثقافت سے روشناس کرانا،جس مین وہ پوری طرح کامیاب ہے۔ہر ایک منظر کی تصویر کشی اس طرح کہ منظر قاری کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

قلعۂ معلّٰی کے شب و روز ،رقص و سرور،شاہی دربار،اودھ کی تاج پوشی ،جمنا گھاٹ ،گومتی ندی ،حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ ،حضرت امیر خسرو کا مزار ،خانقاہ کے صحن میں خوش الحان قوال ثمن برج (شاہانِ مغلیہ کی خاص نشست گاہ) حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ ،مہرولی کا قلعہ حکمت یار خاں کی دیوڑھی ،مرغ کی لڑائیاں ،محلّہ بلی ماراں ،ہندل ندی کا بہاؤ وغیرہ ۱۸۵۷ء کی دہلی کی تہذیب و ثقافت کا بہت گہرائی سے مصنف نے نقشہ پیش کیا ہے۔

تاریخی مستند واقعات جیسے براک پور چھاؤنی کا واقعہ ۶/فروری ۱۸۵۷ء اور منگل پانڈے کی جسارت پر ۸/اپریل ۱۸۵۷ء کو پھانسی وغیرہ مصنف نے واقعات کی ترتیب کا خاص خیال رکھا ہے تاکہ واقعات کی حقیقت مسخ نہ ہو۔تاریخی کردار جیسے بیگم حضرت محل ،جھانسی کی رانی ،بہادر شاہ ظفر،تاتیا ٹوپے،نانا صاحب ،مجاہدین کے ہاتھوں مارے جانے والے انگریز فوجی افسران ،مولانا احمداللہ شاہ کے واقعات کو ناول کی شکل میں ۳۸۱ صفحۂ قرطاس پر مکمل ترتیب کے ساتھ فِٹ کرنا واقعتاً ایک بہت بڑا کارنامہ اور ذمہ داری ہے۔ایک دریا نہیں بلکہ ایک سمندر کو کوزے میں قید کرنے کے برابر ہے جسے مصنف نے کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔

غدارانِ وطن سے انگریزوں کی ساز باز ،سازشیں ،مطلب پرستی ،خود غرضی ،ملک و ملت کے سودے ،رجواڑوں کی بے چینی ،بہادر شاہ ظفر کی بے بسی ،مرزا الٰہی بخش کی غداری ،ناول کے پلاٹ پر مصنف کی پکڑ آخر تک قائم ہے۔زباں و بیان ،تکنیک ،موضوع چاروں اعتبار سے نورالحسنین منفرد نظر آتے

ISSN : 2582 - 3612

ہیں ۔ دورانِ قرأت اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایک جملے پر محنت کرتے ہیں ۔ ایک ایک لفظ سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں، شعوری اور لاشعوری طور پر تحریر میں دلکشی اور جاذبیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو پڑھتے وقت اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی ہے۔ نورالحسنین کا ایک بڑا وصف یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تحریروں سے وہی کام لینا چاہتے ہیں جو ایک مصلح، دانش، فلسفی اور سادھوسنت کا مطمح نظر ہوتا ہے، یعنی وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی تحریریں درد کو سامنے لانے کے ساتھ ساتھ درد کا درماں بھی بنیں مگر اپنی اس کوشش میں تخلیقیت کو نہیں بھولتے، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ ادب کا حسن تخلیقیت میں پنہاں ہے۔

حواشی :

۱۔ اکیسویں صدی میں اُردو ناول ۔ ڈاکٹر سیفی سرونجی ۔ ص نمبر ۳
۳۔ ایضاً ــــــــــ ص نمبر ۱۷
۴۔ ایضاً ــــــــــ ص نمبر ۳۶/۳۷
۵۔ ایضاً ــــــــــ ص نمبر ۳۹
۶۔ ایضاً ــــــــــ ص نمبر ۱۸۴
۷۔ ایضاً ــــــــــ ص نمبر ۱۴۲/۱۴۳
۸۔ ایضاً ــــــــــ ص نمبر ۱۵۳
۹۔ ایضاً ــــــــــ ص نمبر ۲۵۹
۱۰۔ ایضاً ــــــــــ ص نمبر ۱۱۹
۱۱۔ ایضاً ــــــــــ ص نمبر ۶۶
۱۲۔ ایضاً ــــــــــ ص نمبر ۸۹
۱۳۔ ایضاً ــــــــــ ص نمبر ۲۳۸

**Mohammad Muzammil Farooqui**
Research Scholar
Department of Urdu
Dr. B. A. Marathwada University
Aurangabad (Maharashtra)
Mob.- 95037 61084



CamScanner



محمد نبی حسین

# غیاث احمد گدی کے افسانے

آزادی کے بعد اردو افسانے کو نیا لب و لہجہ عطا کرنے والے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام غیاث احمد گدی کا ہے۔ انہوں نے نہ صرف اردو افسانے کو نئی جہت سے آشنا کیا بلکہ تخلیقی سطح پر نئی سوچ کو داخل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کے افسانے اس لیے انفرادیت کے حامل ہیں کہ انہوں نے ایک خاص اسلوب میں اپنی کہانیوں کی تخلیق کی ہے۔ غیاث احمد گدی کا افسانوی سفر تقریباً پینتیس برسوں پر محیط ہے۔ اس درمیان ان کے تین افسانوی مجموعے اور ایک ناولٹ 'پڑاؤ' منظر عام پر آئے۔ اتنی مختصر مدت میں انہوں نے اردو افسانے کو کئی لازوال کہانیاں عطا کی۔

'بابا لوگ' غیاث احمد گدی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو 1969 منظر عام پر آیا۔ اس میں کل نو افسانے شامل ہیں۔ ان میں پانچ افسانے بابا لوگ، ڈورتھی جون سین، بدصورت سیاہ صلیب، پیاسی چڑیا اور صبح کا دامن اینگو انڈین ماحول پر مبنی ہے۔ ان کہانیوں میں تقریباً ایک جیسی فضا اور یکساں موضوع ہے۔ اوسط درجے کے عیسائی، ان کی نمائش، ان کی اخلاقی گراوٹ، نفسیاتی اور جنسی گھٹن اور جنسی بے راہ روی کو غیاث احمد گدی نے کہانی کا روپ دیا ہے۔ باقی چار کہانیوں میں ہندوستانی سماج کے عام افراد کی محرومیوں، الجھنوں اور ناکامیوں کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

غیاث احمد گدی نے جب اپنا تخلیقی سفر شروع کیا تب آزادی کی تحریک عروج پر تھی۔ وہ دور سیاسی و معاشی بحران، سماجی انتشار اور تہذیبی و اخلاقی انحطاط کا تھا اور ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی۔ ظاہر ہے غیاث احمد گدی کا ترقی پسند تحریک سے متاثر ہونا فطری تھا۔ ان کے افسانوں پر اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن فکری طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود انہوں نے اپنے تخلیقی عمل میں تحریک سے الگ ایک نئی راہ نکالی۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ 'دیوتا' ہے جس میں انہوں نے کوئلے کی کانوں میں مزدوروں کا استحصال، معاشی بدحالی سے پیدا ہونے والے مسائل اور مزدوروں کی بیوی کی زندگی کی عکاسی کی ہے لیکن اس کہانی کا اختتام ایسے موڑ پر ہوتا ہے جب مزدور اپنی بیوی پر اپنا بھڑاس اتارتا ہے جیسا کہ سماج میں ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف مالک اس موقعے کی نزاکت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جھوٹی ہمدردی دکھانے کے

ISSN : 2582 - 3612

لیے وہ مزدور کو سزا دینا چاہتا ہے لیکن وہ عورت شدید ردعمل کا اظہار کرتی ہے اور خانگی زندگی میں کسی غیر آدمی کی مداخلت کے خلاف سخت احتجاج کرتی ہے۔ اس لیے یہ افسانہ محض ترقی پسند تحریک کا علمبردار ہی نہیں رہ جاتا بلکہ غیاث احمد گدی کے انفرادی تخلیقی اپج کا پتا بھی دیتا ہے۔ غیاث احمد گدی کے شروعاتی دور کے افسانے 'سڑک اور عورت'، 'رام اوتار' وغیرہ میں ترقی پسندانہ عناصر ملتے ہیں۔

افسانہ 'بابالوگ' میں ایک ایسے بوڑھے شخص کی کہانی ہے جو ہر گناہ سے پاک ہے۔ خدمت گزاری اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ چودہ برس کی عمر سے وہ ایک عیسائی مالک کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیتا ہے۔ اس کی اکلوتی بیٹی مارگریٹ کو اپنے جگر کا ٹکڑا تصور کرتا ہے۔ اس کی سلامتی اور خوشنودی کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ جبکہ بے بی مارگریٹ اس سے شدید نفرت کرتی ہے۔ غیاث احمد گدی نے بڈھا انکل کے کردار کی پیکر تراشی بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ مارگریٹ کے باپ کی زبانی بوڑھے انکل کی تعریف ملاحظہ کیجیے :

''تم نہیں جانتیں، بے بی ڈارلنگ! جب تم ابی نہیں آئی تھیں اور میں شراب کے نشے میں تماری ماں کو محض اس لیے زدوکوب کرتا تھا کہ وہ مجھے ایک بچہ دینے سے مجبور تھی تو بڈھا تماری مدر کے سامنے کھرا ہو جاتا اور پھر بید پوارا اس کے جسم پر توٹ جاتا، وہ اُف تک نہ کرتا تھا۔ صرف اس کے چہرے پر تکلیف کے باعث لکیریں بنتیں، بگڑتیں اور آنکھوں سے پانی جھر جھر بہتا۔ وہ چپ چاپ سہہ جاتا پھر بے بے تم آئیں اور تماری مدر اسی رات مر گئی۔ تو وہ کیسا رویا کیسا تڑپا تھا۔ وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتا۔''

(بابالوگ، ص۔ ۲۵)

دوسری جانب مارگریٹ کو بوڑھے انکل سے شدید نفرت ہے اور رات میں جب وہ زیادہ دیر تک گھر سے باہر رہتی ہے تو وہ بوڑھا انکل رات بھر اس کا انتظار کرتا ہے اور اس کو سمجھاتا ہے کہ اس کا بوائے فرینڈ اسے محض استعمال کر رہا ہے۔ بوڑھے انکل کی زبانی سنیے کہ وہ مارگریٹ سے کیا کہتا ہے:

''نہیں بے بی..... ٹھہرو ذرا..... ٹھہرو۔۔۔۔ بائی گاڈ اَم جھوٹ نہیں بولتا۔ یسوع مسیح جب جارج..... جارج اپنا دل پر سے گزرتا تو اَم کو بہوت تکلیف ہوتا۔ ایسا پاپھک......اس نے سینے پر زور سے گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔ مارگریٹ سمجھ گئی۔ بڈھا کمینہ..... دفعتاً وہ چراغ جو کل رست پچھلی پہر بڈھا انکل کے نوٹ واپس کرتے وقت جل اٹھا تھا، اچانک بھڑک کر بجھ



CS CamScanner



گیا..... بڈھا کمینہ! تم مارا پرسنل بات میں کیوں ٹانگ اڑاتا ہے.... کتا اَم تمارا آنکھ پھوڑ دے گا... سور... وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔''

(بابالوگ، ص۔ ۳۸)

اس کے باوجود مارگریٹ جب جارج کے ہوس کا نشانہ بن جاتی ہے تو بوڑھا انکل اس کی لاج رکھنے کے لیے جو کارنامہ انجام دیتا ہے اسے غیاث احمد گدی نے بڑی فن کارانہ مہارت کے ساتھ ایک نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔

افسانہ 'ڈورتھی جون سین'، بابالوگ کی کہانی سے مختلف ہے لیکن اسی سماج کی معاشی بدحالی اور ان سے رونما ہونے والی سماجی جرائم کا نقشہ کھینچا ہے۔ دونوں افسانے کے نسوانی کردار بھی متضاد صفات کے حامل ہیں۔ بے بی مارگریٹ جوانی کی امنگوں میں کھو کر اپنی آرزو کی حفاظت نہیں کر پاتی تو افسانہ جون سین میں ڈورتھی اپنی پریشانیوں کے باوجود اپنی عزت کو ہر حال میں محفوظ رکھنے کی خواہاں ہے۔

ڈورتھی جون سین ایک ایسی بیوی ہے جو اپنے شوہر کی خاطر اپنی زندگی اور عزت تک کو مٹانے کے لیے تیار ہے۔ اس کا شوہر مہلک مرض کا شکار ہے اور ڈورتھی کے پاس اتنے روپے نہیں ہیں کہ اس کی خاطر کا خواہ علاج کا انتظام کر سکے۔ ڈورتھی اپنے شوہر کی زندگی کو ڈوبتے دیکھ رہی ہے لیکن وہ ہر ممکن کوشش کرتی ہے کہ اسے ساحل نصیب ہو اور اس کے لیے عزت کی پرواہ کیے بغیر ایک ایسے شخص کے پاس جاتی ہے جو کہ جنسی استحصال کو پیسے کے طور پر اختیار کیے ہوئے ہے۔ بظاہر ایک جیولر کے روپ میں کچھ زیورات کو گروی رکھوا کر گروی رکھنے والے کے لیے روپے مہیا کراتا ہے۔ ڈورتھی اس کے حالات سے خوب واقف ہے لیکن اپنی شرافت پر اعتماد کر کے اس کے پاس جاتی ہے اور اپنی خود اعتمادی کو برقرار رکھتے ہوئے دل ہی دل میں سوچتی ہے کہ وہ جیولر شریف عورتوں کو کسی بھی صورت میں آوارگی پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ اقتباس ملاحظہ ہو :

''اگر اپنا آپ ٹھیک ہو تو کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جیولر کو اتنی جرأت ہی نہیں ہوگی کہ وہ کسی شریف خاتون کو آوارگی کی دعوت دے سکے۔ وہ عورتیں آپ ہی جیولر کے پاس اس غرض سے آتی ہیں جو کمینی ہیں، جنہیں گناہ نے اس قدر ملوث کر دیا ہے وہ چند روپے یا لمحاتی عیش کے لیے عصمت تک کو بیچ ڈالتی ہیں۔.......وہ تو شریف ہے۔ جیولر کو کیسے جرأت ہو سکتی ہے۔''

(ڈورتھی جون سین، ص۔ ۱۳۷)

اور جب وہ جیولر کے پاس جاتی ہے تو وہ اس کی حالت زار دیکھ کر کہتا ہے:

''اور روپے کی ضرورت آپڑے تو تو بے تکلف آجائے گا میڈم! زیور نہ بھی ہو

ISSN : 2582 - 3612

تو کوئی حرج نہیں.....صرف آپ کا ہونا کافی ہے۔''

(ڈورتھی جون سین، ص۔۱۳۷)

ڈورتھی جون سین اسے جہنم کی روشنی سے تعبیر کرتی ہے۔ وہ گرجا گھر جا کر یسوع مسیح سے فریاد کرتی ہے۔ وہ گھر لوٹ کر آتی ہے تو دیکھتی ہے کہ اس کا شوہر مر چکا ہے۔ اس طرح اس کی عزت بچ جاتی ہے۔ گویا اس افسانے میں نہ صرف ڈورتھی جون سین کی مفلوک الحالی کی عکاسی معاشی اعتبار سے کی گئی ہے بلکہ اس کی وفاداری، شوہر پرستی اور عزت کے تئیں خودداری کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

غیاث احمد گدی نے ایک طرف بے بی مارگریٹ جیسی جنس اور ہوس پرست کردار کا انتخاب کر کے اینگلو انڈین معاشرتی زوال کو دکھانے کی کوشش کی ہے تو دوسری طرف اس معاشرے کے باقی ماندہ قدروں کو بھی ڈورتھی جون سین کی صورت میں صورت گری کی ہے۔ کیونکہ کوئی سماج یا معاشرہ کلی طور مثبت قدروں سے یکسر گریز نہیں کرتا بلکہ اس میں کہیں مثبت قدروں کی بقا ہوتی ہے۔ گویا افسانہ ڈورتھی جون سین کی ڈورتھی ایک وفادار بیوی کی شکل میں سامنے آتی ہے جو اپنے افلاس زدہ بیمار شوہر کو بچانے کے لیے زیورات گروی رکھتی ہے، برتن بیچتی ہے۔ لیکن جب شوہر کی علالت کا سلسلہ دراز ہو جاتا ہے اور اس کے لیے ڈورتھی کے پاس جسم بیچنے کے علاوہ کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے تو شوہر کی زندگی کی خاطر اپنی عزت بھی بیچنے کو آمادہ ہو جاتی ہے۔ وہ اپنا خالی جسم جیولر کو سونپ دینے کے لیے گھر سے نکلتی ہے۔ راستے میں گرجا گھر ملتا ہے۔ گرجا گھر میں ایسوع مسیح کی تصویر اسے گھر لوٹ جانے پر مجبور کرتی ہے۔

غیاث احمد گدی نے افسانہ 'بدصورت سیاہ صلیب' میں ایک عیسائی لڑکی ڈی سوزا کی زندگی کی المناکی اور جنسی گھٹن کو موضوع بنایا ہے۔ ڈی سوزا جو اپنی امنگوں اور خواہشوں کو دفن کر کے دوسروں کو زندگی بخشتی ہے۔ یہی اس لڑکی کی زندگی کا مقصد ہے۔ جبکہ وہ بھی اپنی زندگی جینا چاہتی ہے لیکن اینگلو انڈین معاشرے کی بدصورت لڑکی اپنی ماں اور بھائی کے لیے تعیش کا سامان مہیا کراتے کراتے اپنی نجی زندگی سے کہیں دور نکل جاتی ہے۔ دفتر کی نوکری، سنیما ٹکٹ کی بکنگ اور ماں کے ناسور ڈریسنگ یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ اس کا باپ بارہ برس قبل کمانے کی غرض سے کلکتہ گیا تھا لیکن لوٹ کر نہیں آیا۔ ایک بھائی ہے جو بہن کی کمائی پر عیش کرتا ہے اور ایک محبوبہ بھی رکھتا ہے۔ اسے اپنی بہن کے پیسے سے ڈرنک بھی کراتا ہے اور المیہ یہ ہے کہ اپنی بہن کو اس کے قصے سناتا ہے۔ اس سبب یہ ہوتا ہے کہ ڈی سوزا کے اندر جنسی تحرک پیدا کر دیتا ہے۔ ڈی سوزا اپنی بیمار ماں کی سہولت و خدمت کے لیے اپنی جوانی وقف کر دیتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اپنی نجی زندگی جیے لیکن اس کی ماں ایسا نہیں ہونے دیتی۔ وہ کہتی ہے:

''تم مجھے کہیں چھوڑ کر چلی نہ جاؤ۔ بے بی.....ڈرتی ہوں.....میں بہت ڈرتی



CamScanner



ہوں.....جس وقت تم میرے زخم کو صاف کر رہی ہوتی ہو، گندے پیپ اور خون سے چپچپاتے ہوئے زخم کو، تو میں تکلیف سے بے خبر یہ سوچنے لگتی ہوں کہ تم کہیں چلی نہ جاؤ.....لیکن پھر یہ سوچ کر دل خوش ہو جاتا ہے کہ تم ایسا نہیں کرو گی کیوں کہ بے بی! سچائی اسے کہتے ہیں جو ہے اور نہیں ہے وہ سب جھوٹ ہے.....مثلاً اس دنیا میں میرے سوا تمہارا باپ بھی تھا۔ تھا تو تھا۔ پر اب موجود نہیں۔ مثلاً یہ کہ کل تمہارا رفیق حیات بھی ہوگا۔ ہوگا بھی یا نہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارے ڈیڈی کی طرح وہ بھی تمہیں ٹھکرا کر چلا جائے۔ اس لیے شکوک کی دنیا میں رہنے سے بہتر ہے کہ انسان یہ سمجھنے لگے کہ کل جو تھا وہ بھی جھوٹ تھا اور کل جو ہے وہ بھی جھوٹ ہے۔''

(بدصورت سیاہ صلیب، ص۔۱۶۴)

ماں کے ایسے خیالات کو سننے کے بعد ڈی سوزا اپنے جذبات کو مارنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی زندگی میں ایسا وقت بھی آتا ہے جب وہ سوچتی ہے کہ اس کی ماں بھی خود غرض ہے اور دنیا میں کوئی بھی رشتہ حقیقی معلوم نہیں ہوتا۔ کبھی وہ یہ سوچتی ہے کہ وہ گھر بار چھوڑ کر چلی جائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ اس افسانے میں عیسائی گھرانوں کے رشتوں کی پامالی کی جانب افسانہ نگار نے اشارہ کیا ہے۔

افسانہ 'پیاسی چڑیا' میں للّی واٹسن کا کردار بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے جو اینگلو انڈین معاشرے میں اپنی ماں اور بھائی مائیکل کے ساتھ ایک معمولی سے تنگ اور بوسیدہ مکان میں رہتی ہے۔ للّی واٹسن ایک فاحشہ لڑکی ہے جو اکثر رات غائب رہ کر پیسے کماتی ہے۔ اس کی ماں مسز جوزیفائن بھی اس راز سے واقف ہے۔ بلکہ اسی کے اشارے اور مرضی پر وہ جسم فروشی کے لیے بڑے بڑے سیٹھ اور ساہوکاروں کے پاس جایا کرتی ہے۔ وہ لوگ اپنی جنسی ہوس پوری کر کے اس کی مٹھی گرم کرتے ہیں۔ للّی جب صبح گھر لوٹتی ہے تو اس کی جھولی میں رات بھر کی کمائی ہوتی ہے۔ اس کی ماں اپنی جوان بیٹی کی کمائی دیکھ کر خوش ہوتی ہے، اسے دعائیں دیتی ہے اور اسے تسلی بھی دیتی رہتی ہے۔

پیاسی چڑیا کا مرکزی کردار للّی واٹسن کو ایسے پیسے کے لیے آمادہ کرتی ہے جس میں نسوانی عفت تار تار ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی ماں للّی کے اندر آمادگی کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے یسوع مسیح تک کی دہائی دیتی ہے اور روپے کی خاطر اپنی بیٹی کی زندگی ایسی آگ میں جھونکنا پسند کرتی ہے جس سے روپے حاصل ہوں۔ اس پیشے سے روپے تو حاصل ہو جاتے ہیں۔ سیٹھوں، امیروں اور عیاشوں سے ماں کا مقصد پورا ہو جاتا ہے لیکن للّی واٹسن کی جنسی خواہشات کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔ اس کام کے عوض اسے پیسے تو مل جاتے ہیں لیکن

ISSN : 2582 - 3612

جنسی پیاس نہیں بجھ پاتی۔ بوڑھے، بدصورت اور آڑے ترچھے مرد اس کے جسم کو روز نوچتے ہیں جس کے لیے اسے خاطر خواہ معاوضہ بھی ملتا ہے۔ لیکن اس کی اپنی خواہش اور اپنا جذبہ مجروح ہوتا ہے۔ وہ خود کبھی جنسی طور پر آسودہ نہیں پاتی ہے کیونکہ اس کے اور اس کے خریداروں کے مابین ہمیشہ خرید و فروخت کا کاروباری معاملہ رہتا ہے۔ اس کا کام کرنے کے لیے اس کی ماں کس طرح یسوع مسیح کی دہائی دیتی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> ''اس دن اس کی ممی نے ادھیڑ عمر کے شراب میں مدہوش روتے ہوئے سیٹھ کو دیکھ کر کہا تھا، بے بی ڈارلنگ جانتی ہو یہ بہت دکھی انسان ہے۔ یہ تمہارے پاپا کا دوست ہے۔.... اس کے جوان لڑکے کا موٹر کار کے حادثے میں موت ہوگیا.... آج سے غریب پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے.... بے بی پیاری تم ذرا اس کا غم دور کرسکتی .... بے بی ڈارلنگ دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھو پیاسے حلقوں میں ٹھنڈے پانی کا قطرہ ٹپکاؤ..... یہی یسوع مسیح نے کہا ہے۔ دھڑکتے ہوئے دلوں پر ہاتھ رکھو... یہی یسوع مسیح نے کہا ہے۔''
>
> (پیاسی چڑیا، ص۔ ۱۷۶)

للّی کے اندر احساس کمتری بھی ہے اس لیے وہ شہر کے بڑے بڑے رئیسوں سے پلنگ پر لیٹ کر ننگ دھڑنگ ہوکر، لوگوں کے منھ پر لات رسید کرتی ہے، فرش پر تھوک کر چٹواتی ہے اور گھنٹوں پاؤں دبواتی ہے۔ وہ اس عمل سے اپنے احساس کمتری کو مٹانا چاہتی ہے۔ جب کہ اس کا بھائی مائیکل اپنی بہن کی حرکات وسکنات سے ناواقف ہے اور دنیا میں ہونے والے معاملات سے بے خبر ہے۔

کہانی کا دوسرا پہلو اس وقت سامنے آتا ہے جب للّی واٹسن عبدل ڈرائیور کے گھر جا کر اس کی بیوی سے محبت سے ہمدردی کا اظہار کرتی ہے اور ایسے موقع پر وہ سیتا ساوتری کی طرح ایک دیوی بن جاتی ہے اور مسلسل تین دنوں تک مسلم ڈرائیور کی بیوی کی خدمت کرتی ہے۔ یہاں عورت کا دوسرا روپ سامنے آتا ہے۔ بہ ظاہر ایک عورت بھی یہی چاہتی ہے کہ وہ کسی کی بیوی بن کر سکون کی زندگی گزارے لیکن حالات عورت کو گناہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

''صبح کا دامن'' ایک فکر انگیز افسانہ ہے جو ایک اینگلو انڈین کالونی کے اردگرد گھومتی ہے۔ کہانی کا محور ایک ایسی بوڑھی عورت ہے جو محلے کے نوجوانوں کے ساتھ صبح سے شام تک فلش کھیلنے، شراب پینے اور ادھ پکے گوشت کھانے میں مصروف رہتی ہے۔ اس نے اپنے لڑکے مائیکل کو جو ریلوے ورکشاپ میں ٹرنر کی تربیت حاصل کر رہا ہوتا ہے، اس سے علاحدہ کر کے گھر کے دروازے پر پہرہ دینے کے لیے بٹھا دیتی ہے تا کہ پولیس کی نگاہ سے محفوظ رہ سکے۔ یہاں غیاث احمد گدی نے ہندوستان سے چلے جانے کے باوجود



CamScanner



اینگلو انڈین خاندان کے افراد کی زبوں حالی کا ذکر کیا ہے۔ ان لوگوں کی زبوں حالی کا عالم یہ ہے کہ ان کے اندر روز بہ روز ابتری آرہی ہے۔ خستہ حالی سے نہ صرف ان کا اخلاق بگڑ رہا ہے بلکہ مجبوری کے ہاتھوں نڈھال ہوکر للّی کی جوانی بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ وہ گردش روزگار کے کفن میں لپٹی ہوئی اپنے ناتواں کاندھے پر اپنے خاندان کا بوجھ اٹھانے پر مجبور ہے۔ دن بھر ایکن ہارڈ وئر اسٹور میں کام کرنے کے بعد شام کو بن سنور کے گلاب کی طرح کھلتی ہے اور اپنی خوشبو سے سیاہ راتوں کی تنہائی میں اپنے چاہنے والوں کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ زندگی کی ضروریات اور کفالت کے لیے غریب جسم فروشی کی پیوندکاری سے چھپائی جاسکتی ہے، زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ لیکن مائیکل کا گرم خون ان حالات سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اسے اپنی ماں اور بہن کی حرکتوں پر اعتراض ہوتا ہے مگر حالات کی چابک کھا کر اپنی باگ ڈور وقت کے ہاتھوں سونپ دیتا ہے۔

اس کہانی میں دو کردار نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں، مائیکل اور اس کی بہن۔ جن کی حرکات وسکنات سے کہانی میں نشیب و فراز آتا ہے اور ایسے عبرت انگیز موڑ بھی جو انسانی اخلاق کی گھناؤنی تصور پیش کرتے ہیں۔ ایک کردار مائیکل کی سیاہ فام ماں بھی ہے جو معاشی بدحالی سے تنگ آکر محلے کے اوباش لڑکوں کو اکٹھا کر کے صبح سے شام تک جوا کھلانے میں مصروف رہتی ہے۔ افسانے میں سب سے سبق آموز نسوانی کردار نوخیز مسلم لڑکی عاصمہ ہے جو محلے کے نلکے پر پانی بھرنے آتی ہے مائیکل جب پانی سے بھرا ہوا گھڑا اٹھا کر اس کے سر پر رکھتا ہے اور اسے جاتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کی معصومیت کے پیش نظر اس پر ایک ردعمل ہوتا ہے اور اللہ کی تشبیہ اس کی نگاہوں میں گردش کرنے لگتی ہے۔ یہ کہانی دراصل کرداروں کے ان واقعات سے مربوط ہے اور اینگلو انڈین کالونی میں جتنے حادثات و سانحات وقوع پذیر ہوتے ہیں، ان کی تفصیلات سے قاری کو آشنا کراتی ہے۔ غیاث احمد گدی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کرداروں کے کارناموں سے اس کے اچھے یا برے ہونے کے بارے میں کچھ نہیں کہتے بلکہ اس کی حرکت وعوامل کو باریک بینی سے پہلے مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس بعد اس کی ظاہری و باطنی پہلوؤں کے درمیان ایک توازن قائم کر کے اس کردار کے اصل رنگ و روپ کی تصویر کشی کرتے ہیں تا کہ قاری خود اس کے نیک و بد کا فیصلہ کرسکے۔

**Md. Nabi Hussain**
Research Scholar
Department of Urdu
B. N. Mandal University
Madhepura (Bihar)
Mob.- 84060 33208

## نادرہ افروز

# پروفیسر علامہ نادم بلخی کی شخصیت ناقدین کی نظر میں

الحاج پروفیسر علامہ نادم بلخی کی شخصیت دنیائے علم وفن میں محتاج تعارف نہیں، ان کی شخصیت معروف عبقری اور کثیر الجہت ادیب وشاعر کی ہے اور ایک ایسی ادبی شخصیت کے کارہائے نمایاں کو ضبط تحریر میں لانا کتنا مشکل ہے جو بیک وقت شاعر، ادیب، محقق، ناقد، صاحب طرز انشا پرداز، مبصر، مدیر، استاد اور ماہر علم العروض غرض جتنے بھی شعبۂ ادب ہیں ان پر عقابی نگاہ رکھنے کے علاوہ ایک مخلص اور نیک انسان بھی تھے وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ایک اچھا فنکار ہونے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ ایک اچھا انسان ہو۔

پروفیسر علامہ نادم بلخی نے عمر بھر صرف اردو زبان وادب کی خلوص اور ایمانداری سے خدمت ہی نہیں کی بلکہ اپنے صالح ادب کی تخلیق بھی فرمائی ہے وہ اپنے علم وفن کے چراغ سے اطراف کو بھی ضیا بار کرتے رہے اور تشنگانِ علوم وفنون کو بھی سیراب کرتے رہے۔ ویسے تو دنیائے شعر وادب میں ایسی شخصیتوں کی کمی نہیں جنھوں نے اپنی ادبی کاوشوں سے صرف حیران ہی نہیں کرتیں بلکہ بے پناہ حوصلہ بھی فراہم کرتی ہیں۔ ہماری ادبی تاریخ ایسے ادبا وشعرا سے بھری پڑی ہے۔ جنھوں نے اپنی تخلیقات سے بے شمار حیرت انگیز کارنامے انجام دئے ہیں جن سے ادبی دنیا نہ صرف متحیر ہے بلکہ بے پناہ حوصلے لے کر اپنی راہِ ادب کو روشن کرنے میں مصروف ہے۔ میر تقی میر نے اردو شاعری کو دھڑکنا سکھایا تو غالب نے اپنے تجربوں کو شعر کا قالب عطا کیا تو وہ زبان زد عام ہو گئے۔ ایک مصرعہ یا ایک شعر میں مشاہدات اور تجربات کی ایک دنیا نہ صرف سمٹ گئی بلکہ منعکس اور زرافشاں بھی ہو گئی۔ اگر اس کا سرسری جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ علامہ شبلی نعمانی نے اپنی زندگی میں اتنا لکھا کہ کم وبیش پچاس صفحات کی اوسطاً استعجاب میں ڈال دیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر راہی فدائی ''حضرت ذوقی ویلوری اکثر ایک بیٹھک میں سات سو اشعار تخلیق کر لیا کرتے تھے اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے ایک نشست میں ایک ہزار اشعار بھی وضع کئے تھے۔ بعض شعرا نے تو ایک دن میں پوری کی پوری مثنویاں قلم بند کی ہیں لیکن بڑی بات یہ نہیں ہے کہ ان لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا معیاری وفنی اعتبار سے قابل قدر ہے اور ہمارے کلاسیکی ادب کے لئے بیش بہا سرمایہ ہے۔ دراصل علامہ نادم بلخی کا شمار بھی بسیار گو شعرا میں ہوتا ہے۔ نادم بلخی نے جس سمت اپنے ذہن کو مبذول کیا، ایک دفتر عطا کر گئے اور اپنی معیاری



CS CamScanner



شاعری سے ایک رجحان بھی عطا کیا ہے۔ ڈاکٹر سید حسن عباس نے اپنے مضمون '' کچھ اس کتاب کے بارے میں'' (ذکر نادم بلخی کے تعارف میں) بڑی صاف گوئی سے یہ لکھا ہے کہ:

> ''نادم بلخی ایک رجحان ساز شخصیت اور فنکار کا نام ہے۔ آنے والے دنوں میں ادب کو ان کی دین کا بھرپور اور تفصیلی جائزہ اس بنیادی خیال کے پسِ منظر میں لیا جائے گا۔''
>
> (ذکر نادم بلخی، ص۔ ۱۵)

پروفیسر نادم بلخی کی شخصیت قابل رشک تھی کہ اپنی انتھک فنی ریاضتوں سے علمی وادبی کارناموں سے اردو شعر وادب کو مالا مال کیا ہے جسے یک لخت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بقول قیوم خضر :

> ''ان کے (نادم بلخی) بارے میں مجھے جو بات کہنی ہے وہ یہ ہے کہ چالیس برسوں سے لگاتار اردو ادب کی خدمت کرنے والے کو خادم تو کہا جا سکتا ہے مگر نادم نہیں، مسلسل اور انتھک فنی ریاضتوں نے ان کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا ہے کہ کوئی ان کے علمی وادبی کارناموں کو یک لخت نظر انداز یا فراموش کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا۔''
>
> (ذکر نادم بلخی، ص۔ 70)

اردو ادب کے بے لوث خدمت گاروں میں پروفیسر نادم بلخی کا نام نمایاں ہے جن کی خدمات کو یکسر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ عہد میں بالیدہ فکر ونظر رکھنے والے ادبا وشعرا کی کمی نہیں۔ ایسے ہی نادر المثال شخصیتوں میں علامہ نادم بلخی کا نام قابل ذکر ہے۔ جو پوری زندگی اردو شعر وادب کو ہی اپنا مقصد زندگی سمجھتے رہے۔ طالب علمی کے زمانے سے آخری ایام تک یعنی لگ بھگ 70 دہائیوں سے زائد اردو شعر و ادب کی بے لوث خدمات انجام دئے ہیں۔ بقول غالب ع نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا' کئے بغیر وہ گوشہ نشیں ہو کر خدمت ادب کرتے رہے۔ انہیں نہ تو شہرت کی تمنا رہی اور نہ ہی کبھی کسی منصب کی خواہش کی۔ اور نہ ہی کسی کی حاشیہ برداری قبول فرمائی اور نہ گروہ بندی کے شکار ہوئے۔ ظہیر غازی پوری نے اپنے مضمون ''نادم بلخی۔ ہمہ جہت شخصیت'' میں تحریر فرماتے ہیں :

> ''نادر المثال شخصیتوں میں محترم نادم بلخی صاحب کا نام نامی بھی شامل ہے۔ جو پانچ دہائیوں سے شعر وادب کی بے لوث خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ بے لوث خدمت گار اس معنی میں ہیں کہ انہوں نے زندگی کے کسی حصے میں ستائش اور صلے کی پروا نہیں کی۔ شہرت اور منصب کے حصول کے

ISSN : 2582 - 3612

لئے نہ گروہ بندی کی ضرورت محسوس کی، نہ ادبی سیاست میں ملوث ہوئے اور نہ کسی ادبی شخصیت کی حاشیہ برداری کو ضروری سمجھا۔ جو شخص اپنے آپ میں بحر بے کنار ہوتا ہے وہ ایسی بدعتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کہا جاتا ہے کہ مشک اور علم چھپانے سے نہیں چھپتا۔ خوشبو ہو یا روشنی کبھی قید نہیں کی جا سکتی۔ مشک کی خوشبو اور علم کا نور بہر حال دور دور تک پھیل کر ہی رہتا ہے۔''

(ذکر نادم بلخی، ص۔ 73)

خود نادم بلخی فرماتے ہیں ؂

رنگ نہیں امول بناتا قیمت آب کی ہوتی ہے
ورنہ کچھ بھی فرق نہیں ہے کنکر اور نگینے میں

پروفیسر نادم بلخی کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ جس کا اعتراف کئی ناقدین نے ان کے کارناموں کی بنیاد پر کر چکے ہیں۔ وہ بیک وقت بلند پایہ استاد شاعر تھے تو بلند قامت نثر نگار بھی، مایہ ناز نقاد بھی، محقق بھی، سوانح نگار بھی، اور مستند ماہر عروض بھی تھے۔ یعنی نادم بلخی ایک قد آور اور پہلودار شخصیت کے حامل تھے۔ ڈاکٹر منظر حسین اپنے مضمون ''نادم بلخی۔ اردو کا کثیر الجہت فنکار'' میں یوں رقم طراز ہیں:

''آزادی کے بعد صوبہ بہار میں شعر و ادب کی آبیاری میں جن قلم کاروں نے اپنا خون جگر صرف کیا ان میں ایک نمایاں نام پروفیسر ابراہیم نادم بلخی ایک بلند و قد آور اور پہلودار شخصیت کے حامل ہیں۔ اور اردو ادب کو کئی جہتوں سے مالا مال کیا ہے۔ آپ کئی حیثیت سے ایک مستند اور معتبر ماہر عروض، بلند پایہ محقق، قادر الکلام شاعر، مایہ ناز نقاد، کے علاوہ ایک کہنہ مشق اور معزز استاد کی ہے۔''

(ص۔ ۹)

کچھ اسی طرح کی بات آنجہانی ششی ٹنڈن نے بھی پروفیسر نادم بلخی کی شخصیت سے متعلق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور موصوف کو ایک عبقری شخصیت تسلیم کرتے ہوئے اسی عنوان سے اپنے مضمون میں یوں رقم طراز ہیں :

''حضرت نادم بلخی صاحب کی عبقری شخصیت پر کچھ بھی تحریر کرتے وقت قاری کو بہت سی مشکلیں درپیش آتی ہیں۔ ایک ایسی ادبی شخصیت کے کارہائے گراں مایہ کو ضبط تحریر میں لانا جو بیک وقت شاعر، ماہر عروض، صاحب طرز، انشا پرداز، مبصر، مدیر، اور نقاد یعنی ادب کے جتنے بھی گوشے اور محکمے ہیں جملہ شعبۂ جات


CS CamScanner



اور محکموں پر گہری نگاہِ اختیار رکھتا ہو اور اس سے بڑھ کر ایک اچھا انسان بھی ہو۔ نادم بلخی صاحب ایک ایک بطل ایک نادر شخصیت ہیں۔ جن کی شخصیت اور ادبی خدمات کا احاطہ کوزے میں سمندر کو قید کرنے کے مترادف ہے۔''

(ص۔ 159)

پروفیسر نادم بلخی جہاں بلند و قد آور شخصیت کے مالک تھے وہیں ایک شفیق اور معزز استاد اور عمدہ انسان بھی تھے۔ جس کا ثبوت آنجہانی ششی ٹنڈن کے مندرجہ بالا سطور سے ہوتا ہے۔ نادم بلخی بحیثیت انسان اور معزز استاد کے مَیں آگے تفصیلی جائزہ پیش کروں گی۔ لیکن یہاں ایک اور عبقری شخصیت، مستند نقاد و محقق نظام صدیقی کے چند سطور پیش کرنا چاہوں گی جن سے نادم بلخی کی شخصیت اور کھُل کر واضح ہو جائے گی۔ وہ اپنے مضمون ''جمالیاتی اور اقداری منبع نور کے تخلیقیت گذار عابد علامہ نادم بلخی'' میں لکھتے ہیں:

''پروفیسر علامہ نادم بلخی ایک گوشہ نشین قادر الکلام تخلیقیت آفریں شاعر ہی نہیں، بلکہ ایک مستند معتبر اور مؤقر ماہر عروض بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی دیدہ وری اور دردمندی سے عروض شناسی کی چٹان کو نئی نسل کے لئے بہتا ہوا پانی بنا دیا ہے۔ جو نہایت فطری طور پر سادہ دلوں اور معصوم ذہنوں تک اپنی راہ بنا گیا ہے اور ان کی نمو پذیر شخصیت کا زندہ اور دھڑکتا ہوا حصہ بن جاتا ہے۔''

(ص۔159)

پروفیسر علامہ نادم بلخی کی شخصیت جہاں پُرکشش اور لائق مطالعہ ہے وہیں ان کی رحم دلی اور انسان دوستی بھی قابل رشک ہے۔ وہ ہر کسی کو یکساں اور ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور بہت اصول پسند انسان تھے غیر اصولی باتیں انہیں بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر مقبول منظر اپنی آنکھوں دیکھا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد رٹائرمنٹ کا بقایہ رقم جو رانچی یونیورسٹی رانچی نے بذریعہ چیک ادا کیا تھا وہ اتفاق سے بینک میں کیش نہیں ہوا۔ پروفیسر بلخی اس بات کو لے کر کافی ناراض ہوئے۔ اس کیس میں آنجہانی جگد یشور پرساد ایچ اوڈی ہندی بھی تھے، اس معاملے کو لے کر پروفیسر بلخی نے یونیورسٹی کے آفسروں پر ہائی کورٹ میں مقدمہ کر دیا۔ رجسٹرار نے مقدمہ کے صلح کے لئے آنجہانی پروفیسر منیشور سنگھ پرنسپل جی ایل اے کالج کو پروفیسر بلخی کے دولت خانہ پر بھیجا۔ جن کے ہمراہ ان کا چپراسی جتن بھی تھا۔ کمرے میں پرنسپل صاحب اور بلخی صاحب کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی کہ بلخی صاحب کی نظر جتن پر پڑی۔ آپ نے، فوراً جتن سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔ جتن! باہر کیوں کھڑے ہو، اندر آ کر بیٹھو! یہ بلخی کا گھر ہے پرنسپل کا چیمبر نہیں۔ اس واقعہ کو پیش کرنا صرف اس لئے ضروری سمجھا تا کہ بلخی صاحب کی انسانیت

ISSN : 2582 - 3612

اوران کی ہمدردانہ کیفیت کا بخوبی اندازا ہوسکے۔مقبول منظر کو یہ بھی کہتے سُنا ہے کہ جب بلخی صاحب کالج میں اکزامیشن کنٹرولر کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھے تو اکثر کوئی نہ کوئی چپراسی انہیں خوش کرنے کی غرض سے تھوڑی سی سبزیاں وغیرہ لے کر بلخی صاحب کے گھر آتا کہ سر! یہ سبزی گھر میں پیدا ہوئی ہے سولے کر آیا ہوں۔آپ اسے ناراض نہیں کرتے بلکہ گھر میں جاتے اور پچاس،سو روپئے کی نوٹ لے کر آتے۔''یہ لو، رکھ لو، اتنی دور سے آئے ہو، رکشا سے چلے جانا'' یہ کہتے ہوئے روپیہ اس کے ہاتھ میں تھما دیتے۔وہ خوشی خوشی گھر واپس لوٹ جاتا۔غرض کسی سے کبھی کوئی ذاتی کام یا فائدہ یوں ہی نہیں لیا۔یہ ان کا اعلیٰ معیار واخلاق تھا۔

مظہر امام کو کون نہیں جانتا۔وہ اپنے عہد کے رجحان ساز اور صفِ اول کے شاعر گذرے ہیں اور بحیثیت ناقد بھی ان کی شناخت مسلم ہے۔وہ پروفیسر بلخی کے ہمعصر دوستوں میں تھے۔لگ بھگ ایک ہی زمانے میں لکھنا پڑھنا بھی شروع کیا تھا۔وہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''نادم بلخی ایک نہایت عمدہ شاعر، عمدہ انسان اور نہایت عمدہ دوست ہیں۔ادبی اور عروضی معاملات میں اپنے بعض شکوک رفع کرنے کے لئے میں نے اکثر ان سے رجوع کیا۔''
>
> (ذکر نادم بلخی، ص۔50)

پروفیسر نادمؔ بلخی کی شخصیت اوران کی علمی وادبی صلاحیتوں اور انسان دوستی کا اندازہ چند دانشوروں کی آرا سے بخوبی ہوجاتا ہے۔بلخی صاحب عمر بھر صالح ادب کی تخلیق کرتے رہے۔کئی نسلوں کی آبیاری، نو آموز شعرا کی رہنمائی، ریسرچ اسکالروں کی رہنمائی کے ساتھ وقت، محنت، اور پیسوں کی قربانی بھی دی۔میں اپنے اس قول کی اثبات میں ظہیر غازی پوری کے مضمون سے ایک اقتباس اور پیش کرنا چاہوں گی۔ملاحظہ کیجئے:

> ''جناب نادمؔ بلخی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔کسر نفسی، اخلاق، رواداری اور اپنائیت ان کا شیوہ یا جوہر ذاتی ہے، وہ سب کے دوست ہیں، ان کا کوئی دشمن نہیں۔انہوں نے ایک طرف تخلیقی کارنامے انجام دئے اور دوسری طرف تین چار نسلوں کو اردو زبان وفن کی اعلیٰ وارفع قدروں سے آگاہ کیا۔بے شمار نو آموز شعرا کو شعر کے محاسن ومعائب کا درس دیا۔ان گنت ریسرچ اسکالروں کی قدم قدم پر رہنمائی کی اوران کے لئے وقت، محنت اور پیسوں کی بھی قربانی دی۔ان کا نام جب بھی زبان پر آتا ہے میری نگاہیں احترام سے جھک جاتی ہیں اور زبان سے یہ فقرہ ادا ہوتا ہے۔۔۔ابھی کچھ لوگ باقی ہیں۔''
>
> (ص۔84)



CS CamScanner



مختصر یہ کہ پروفیسر الحاج نادم بلخی کی شخصیت کئی جہت سے نمایاں نظر آتی ہے جسے ضبطِ تحریر میں لانا یقیناً دشوار ہی نہیں سمندر کو کوزے میں قید کرنے کے مترادف ہے۔بلخی صاحب کی شخصیت اور خدمات کے اعتراف میں مجلّہ توازن مالیگاؤں مہاراشٹرا، اور ماہنامہ حریم ناز جموکشمیر نے خصوصی اشاعتؓ جا اہتمام کیا۔روز نامہ انقلاب جدید، پٹنہ نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۶ کی اشاعت میں بلخی صاحب پر ایک گوشہ شائع کیا تھا جسے ڈاکٹر ریحان غنی نے ترتیب وتدوین سے آراستہ کیا تھا۔بلخی صاحب خود فرماتے ہیں۔

کچھ جنوں والے سمجھتے ہیں ہمارا رتبہ
ورنہ کہنے کو تو رسوا سرِ بازار ہیں ہم

**Nadira Afroz**
Research Scholar
Department of Urdu
G. L. A College
Daltonganj (Jharkhand)
Mob.- 79911 40026

**نیاز احمد**

# حسین الحق بحیثیت افسانہ نگار

اردو افسانے کی تاریخ میں حسین الحق کا نام سنہرے باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو فسانے کی تاریخ آپ کے ذکر کے بغیر ادھوری تسلیم کی جائے گی۔ آپ ایک فکشن نگار کی حیثیت سے اپنی انفرادیت کا لوہا منوانے میں کامیاب رہے۔ حال ہی میں آپ کی ادبی خدمات کے اعزاز میں آپ کو ساہتیہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ لیکن بہت افسوس کی بات ہے کہ حسین الحق تقریباً تین سال سے علیل تھے اور بالآخر آپ شاہد حقیقی سے جا ملے۔ یہ ادبی حلقے کے لئے کافی نقصان کا پہلو رہا۔ ان کی کمی کو پورا کرنا بہت ہی مشکل مرحلہ ہے۔ مختصر یہ کہ حسین الحق مسلسل طور سے ادبی منظرنامے پر اپنی فعالیت کو درج کرانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ آپ کے کئی افسانوی مجموعے یادگار ہیں جیسے ’’پس پردہ، شب مطلع، سوئی کی نوک پر رکا لمحہ۔ بارش میں گھرا مکان، صورتحال، گھنے جنگلوں میں، چادر، نیو کی اینٹ‘‘ وغیرہ۔ آپ نے جدیدیت کے حوالے سے بھی کئی افسانے لکھے لیکن اس عہد کی بھی تحریر کردہ آپ کی کہانیاں معمہ ثابت نہیں ہوئی، لہٰذا کہا جائے گا کہ آپ کی کہانیاں زندگی کے مختلف شیڈس کو سامنے لانے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ آپ نے متنوع موضوعات پر افسانے قلمبند کئے ہیں جن سے آپ کی مشاہداتی قوت عمیق مطالعے گہرے تجربات کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کی افسانوی جہت کے سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

> ’’حسین الحق ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے علامت کو تخلیق میں بدل بنا کر اساطیر اور ڈرامائی اسلوب کی فضا تیار کی اور مذہب و تصوف کے پس منظر نے جن کے یہاں اعتبارات کی حیثیت اختیار کی اور جنہوں نے فرد کی بے سکونی اور کم مائیگی کا جواز مذہبی اور تہذیبی اقدار کے انقلاب میں تلاش کیا وہ وسیع نظریات جن کا تعلق روحانی ارتقا سماجی اور تمدنی بین الاقومیت اور مابعد الطبعیاتی انقباط سے ہے۔ حسین الحق کے کرب سے شانہ ملا کر موضوعات کی تشکیل کرتے ہیں اور ان کے یہاں ایک پر اسراریت پورے تخلیقی ماحول پر طاری رہتی ہے۔ ان کے یہاں تاریخ،



CamScanner



> مذہب اور تصوف کا ایسا امتزاج ملتا ہے جو ان کے موضوعات کو ایک تکمیلیت عطا کرتے ہیں۔‘‘
>
> (بہار میں اردو فکشن ایک تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر احمد صغیر، ص۔۸۷۔۱۸۴)

آپ کے افسانے اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ یہاں ماضی پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے گا کہ ماضی کی بازیافت کا عمل آپ کے یہاں کافی حد تک شدید تر ہے۔ مطلب یہ کہ آپ کے قلم ماضی کی دھندلکوں کا امیر ہے۔ اس پر اضافہ یہ کہ موضوعاتی تنوع بھی آپ کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثال کے طور پر رومانیت سیاست عصری المنا کی کی ظلم و جبر کی کہانی اور نامساعد حالات کی گہما گہمی آپ کے بیشتر افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ آپ کی افسانوی جہت کے سلسلے سے پروفیسر وہاب اشرفی رقم طراز ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

> ’’حسین الحق کا افسانہ وقنا عذاب النار دیکھئے تیس برس سے ایک لاش کمرے میں گل سڑ رہی ہے۔ اب لوگوں کو اس لاش کا احساس ہوتا ہے کہو گے اس سے نجات حاصل کرنے کی فکر میں ہیں کہ یہ لاش غائب ہو جاتی ہے اور دو حصوں میں تقسیم ہو کر وقت بے وقت گھروں میں دستک دیتی ہے اور انہیں شکار بناتی ہے، ہوسکتا ہے حسین الحق ہندو مسلم نفاق کا استعارہ لاش کو بنائے ہوئے ہوں کہ دونوں اب ایک دوسرے کی زندگی کے درپے ہیں۔‘‘
>
> (ایضاً، ص۔۷۵)

اس اقتباس کی روشنی میں کہ کہا جائے گا کہ حسین الحق کے یہاں ماضی کی بازیافت دیکھنے کو ملتی ہے۔ سیاسی موضوع کے حوالے سے آپ کا تحریر کردہ افسانہ ’’نیو کی اینٹ‘‘ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس افسانے کے ذریعہ حسین الحق نے ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کے انہدام نے کس طرح ہندوستانی مسلمانوں کو خوفزدہ کیا تھا۔ اس پہلو کو پیش کیا ہے۔ مختصر یہ کہ سانحہ بابری مسجد نے کس طرح انسانی زندگی میں تصادم لایا تھا اسے حسین الحق نے اس افسانے کے ذریعہ ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں احمد صغیر رقم طراز ہیں، ملاحظہ کیجئے:

> ’’افسانہ ’نیو کی اینٹ‘ پڑھیں گے تو لگے گا کہ ایک ترقی پسند افسانہ نگار کے قلم سے لکھا گیا یہ افسانہ ہے جب شیو پوجن اجودھیا سے اینٹ لے کر گھر آتا ہے اور گھر کے باہر بھجن کیرتن اور درشن کے لئے لوگ اُمڈ پڑتے ہیں تو سلامت اللہ اور اس کے پریوار کا خوفزدہ ہونا فطری تھا اور آفس میں جب لوگ یہ باتیں

ISSN : 2582 - 3612

کرتے ہیں کہ شیو پوجن کی پانچویں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہے اور
کیوں نہ ہو اس کو ۱۹۴۷ء جیسا تصادم تو مان ہی لیا گیا ہے تو کل شیو پوجن مجاہد
آمادی کا پنشن بھی لے گا۔ جو درشن کرتا ہے وہ ان بھی دیتا ہے اور پھر
دھارمک سنگھرش یہ ایک حصہ بن کر شیو پوجن راتوں رات دھارمک بھی بن
ہی گیا ہے۔ ہندوستان کا المیہ ہے کہ یہاں راتوں رات لوگ دھارمک بن
جاتے ہیں اور وہ سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں جو مذہبی پیشوا بھی نہیں کرتے۔''

(ایضاً،ص۔۱۸۵)

مختصر یہ کہ اس افسانے کے ذریعہ حسین الحق نے سانحہ بابری مسجد نے کس طرح انسانی زندگی کو متاثر کیا تھا اسے طشت از بام کیا ہے۔ آپ کا تحریر کردہ افسانہ ''بارش میں گھرا مکان'' تہذیبی زوال کو سامنے لاتا ہے۔ اس موضوع پر بہت کم افسانے لکھے گئے ہیں لیکن حسین الحق کا مشاہدہ گہرا ہے اور آپ کا قلم یہاں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے اس افسانے کے ذریعہ آپ نے نئی نسل کو نیا پیغام بھی دیا ہے۔ وہ یہ کہ رات سے جڑے رہنے میں کتنی عافیت محسوس ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حسین الحق کے آگے پرانے اقدار کی پاسداری اور تقویٰ میں زندگی کا حاصل ہے جسے کھو کر زندگی کے اسرار و رموز تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے سے ڈاکٹر تسنیم کوثر فاطمہ رقم طراز ہیں :

''بارش میں گھرا مکان بھی بظاہر ایک بوسیدہ مکان کی کہانی نظر آتی ہے لیکن ا
س کہانی میں دراصل جو بات علامتی پیرایہ اظہار کے طور پر بیان کی گئی ہے وہ
پرانی قدروں کی پامالی ہی ہے۔ چھوٹے بھائی کے ذریعہ بوسیدہ کتابوں کی
منتقلی یا اسے عبث یا بیکار سمجھنا دراصل پرانی تہذیب سے بیگانہ ہونے کا
استعارہ ہے۔''

(جدید اردو افسانے کے چند اہم فنکار، ڈاکٹر تسنیم فاطمہ،ص۔۹۶)

موضوع فساد اور قتل و غارت گری پر بھی حسین الحق نے کئی افسانے تحریر کئے ہیں۔ افسانہ کربلا میں فسادات جمشید پور اور ذکی انور کی شہادت کو موضوع بنایا گیا ہے اس افسانے کے ذریعہ حسین الحق نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ اب سیکولرزم پر لوگ توجہ نہیں دیتے ہیں بلکہ دو قوموں کی آپسی تضادات بڑھ گئی ہے کہ ایک فنکار کی جان بھی فسادات میں بخشی نہیں جاتی ہے۔ جبکہ فنکار کو اس بات کا شائبہ تک نہیں ہوتا ہے وہ بھی قومی تضادات کا شکار ہو جائے گا۔ مختصر یہ کہ اس افسانے کے ذریعہ حسین الحق نے جس طرح سیکولرزم کا بھی ذکر کیا ہے اس سلسلے میں افسانے کا یہ اقتباس دیکھئے :



CamScanner



''میرا جی چاہ رہا ہے کہ پکار کر کہوں ذکی بھائی اب بس کیجئے اس کا کچھ حاصل
نہیں لیکن میرے ارد گرد کی فضا میرے ارادوں کا قاتل ہے اور چاروں طرف
بوٹوں کی ٹاپ گونج رہی ہے۔.....ٹاپ......ٹاپ........ٹاپ۔''

مختصر کہ حسین الحق کے افسانے انسانی زندگی کو نیا شعور عطا کرتے ہیں۔ آپ کے ابتدائی افسانوں میں علامتی رنگ جلوہ نما ہے۔ لیکن بہت جلد ہی آپ نے بیانیہ کی طرف واپسی کی اور ڈوبتے ہوئے مکان دھند میں ایک نظارہ چھلاوہ اور صورت حال جیسے افسانے تحریر کئے۔ لہٰذا یہ کہا جائے کہ حسین الحق اپنے افسانوں کے ذریعہ عصری عہد کی سیاسی و سماجی حقیقت اور زندگی کے سیاق و سباق سے ہمیں روشناس کراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے افسانوں میں احساس کی شدت اور تڑپ کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ آپ کے افسانوں کے کردار کی زبان منظر و ماحول کے عین مطابق ہوتی ہے۔ آپ کہیں بھی مصلحت پسندی گوارہ نہیں کرتے ہیں۔ منظر و ماحول کے مطابق کردار جو زبان بول سکتا ہے اسی زبان کا آپ اپنے افسانوں میں استعما ل کرتے ہیں۔ گویا موضوعاتی سطح پر آپ اپنے موضوع کو نئی جہت تو عطا کرتے ہیں اسلوبیاتی سطح پر بھی آپ کو یہ کمال حاصل ہے کہ آپ ہر طبقے کی زبان اور کردار سے واقف ہیں۔ یہ آپ کے مشاہدے کا کمال ہے اور طرز اظہار کی سلیقہ شعاری بھی۔

مذکورہ بالا تمام باتوں کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ حسین الحق کے افسانے ہمیں مایوس نہیں کرتے ہیں۔ آپ ہمیں روایت سے جوڑنے کے ساتھ ساتھ صورت حال سے بھی متنبہ کرتے ہیں اور یہی حسین الحق کا اختصاص ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جو انہیں اپنے معاصرین سے ممتاز و ممیّز کرتی ہیں۔

**Neyaz Ahmad**
Research Scholar
Department of Urdu
L. N. Mithila University
Darbhanga (Bihar)
Mob. - 98011 71206

**Dr. Imteyaz Ahmad**
Supervisor
Department of Urdu
Mahatma Gandhi College
Darbhanga (Bihar)

ISSN : 2582 - 3612

صادق حسین

# مولانا اعجاز احمد اعظمی کی خطوط نگاری کے نمایاں پہلو

خطوط نگاری کی اہمیت وافادیت سے انکار ممکن نہیں، خطوط بیک وقت قصہ گوئی اور تاریخ کا حسین امتزاج کہے جانے کے مستحق ہیں۔ خط سے مراد مکتوب نگار کے ذریعہ مکتوب الیہ کے نام رقم کی گئی وہ تحریریں ہیں جن میں مکتوب نگار اپنے خیالات وجذبات پیش کرتا ہے۔

دوسرے اصناف سخن کی طرح خطوط نگاری کے لئے بھی موضوع، ہیئت واسلوب کی اپنی خاص اہمیت ہے۔ خطوط کے لئے کسی خاص موضوع کی پابندی نہیں بلکہ مختلف النوع موضوعات جن کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہے خطوط کا موضوع بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خطوط نگاری میں ان تمام موضوعات کی پیشکش بے تکلفانہ انداز میں ہوتی ہے جن کا تعلق ہماری زندگی سے ہے لیکن مکتوب نگار اس پہلو کے تحت محتاط رہتا ہے کہ بے تکلفی کے ساتھ ساتھ تہذیب وشائستگی بھی اپنی جگہ قائم رہے۔ ساتھ ہی مکتوب نگار اپنی شخصیت کے داخلی کوائف، اپنے عہد کے احوال وآثار اور اپنے ہمعصروں کے شخصی وادبی کارہائے نمایاں کا بیان غیر جانب دار طور پر کرتا ہے۔ اسی طرح ہیئت کے اعتبار سے تاریخ، مقام تحریر، القاب وآداب، مکتوب الیہ کا پتہ اپنی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے بغیر اچھے خط کا تصور ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تصنع، بناوٹ واستعارات سے مکتوب نگار کوئی سروکار نہیں رہتا۔ ڈاکٹر عبدالحق کہتے ہیں:

> ''خطوط سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہوسکتا۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اس طرح قلم سے بیان ہوتا ہے یا یوں کہیں کہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑوں پر نکال کر رکھ دیتا ہے۔''

(ڈاکٹر عبدالحق مقدمات عبدالحق مرتب عبادت بریلوی، ص۔۹۳۳)

مطبوعات ومخطوطات کے نادر نسخے کی موجودگی کے اعتبار سے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کی اپنی ایک الگ شناخت قائم ہے۔ یہ بات اپنی جگہ کم نہیں کہ مشاہیر کے خطوط کی بڑی تعداد تقریباً ۳۰۰۰ اس لائبریری میں محفوظ ہے۔ ان مشاہیر میں محمد حسن، مسعود حسن، مسعود حسین خان، غلام السیدین، احتشام



CamScanner



حسین، آل احمد سرور، گیان چند جین، مالک رام، قاضی عبدالودود، رشید احمد صدیقی، سید سلیمان ندوی، پروفیسر گوپی چند نارنگ وغیرہ ہیں۔ ادبی دنیا میں ایک معتبر نام گوپی چند نارنگ کا بھی ہے۔ ان کی ادبی شخصیت اوصاف سے مزین ہے۔ تنقید وتحقیق لسانیات سفرنامہ سے متعلق ان کی بہترین تخلیقی کاوشیں ان کی علمیت اور ذہانت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ جس کا اعتراف پوری ادبی دنیا کرتی ہے اور آنے والی نسل بھی ان کی ادبی دستاویزات سے مستفیض ہوتی رہے گی۔ انہوں نے اردو تنقیدی بصیرتوں کے رجحانات اور غور وفکر کے وسیع امکانات سے روشناس کرایا ہے اور ساتھ ہی اردو تنقید میں ذات پر مبنی تعصّبانہ اور فیشن پرستی سے انحراف کی صورت پیدا کی ہے۔

اسی طرح مولانا کا انداز بیان بے ساختہ اور فطری ہوتا ہے۔ آپ کی تحریر کی بے ساختگی دیکھنی ہو تو دیار نبی ﷺ کا سفرنامہ ''شہنشاہ کونین'' کے دربار میں پڑھ جایئے۔ ابتدا سے انتہا تک شدت عشق رسول ﷺ کا احساس اور ایسا احساس گویا ہم دیار رسول ﷺ میں پہنچ گئے ہیں۔ یہ کتاب ایک عاشق رسول امتی کی عقیدت کا مظہر ہے اور یقین ہے کہ یہ عقیدت نامہ بھی آپؐ کے درجات کی بلندی کا سرمایہ ہوگا۔ چلیے عشق رسول ﷺ سے معطر آپؐ کے جملوں میں روضۃ من ریاض الجنۃ کی سیر کرتے ہیں:

> ''جنت کی اس کیاری میں قدم رکھنے والا ٹھٹھک جاتا ہے، یہیں پڑے ہوں گے میرے آقا کے قدم، ان کے صحابہؓ کے قدم وہ جھجھکتا بھی ہے کہ کیسے رکھے یہ گنہگار قدم ان نقوش پر جنہیں ممین نے شہنشاہ کونین کا نشان قدم سمجھ کر اپنے سینہ میں محفوظ کر رکھا ہے۔ مگر اسے حوصلہ ملتا ہے اس تعلیم سے کہ رسول کے نقش قدم پر چلو، وہ بے تابانہ قدم جماتا ہے۔''

(مولانا کے خطوط، ص۔۵۵)

ادب میں خطوط ومکاتیب کی مستقل اہمیت ہے۔ آپؐ کے خطوط بھی سائل کی باتوں کے تشفی بخش جواب ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کے شہکار ہیں۔ بانی التحیل مولانا ابن الحسن عباسیؒ کو ان کی کتاب ''یادگار زمانہ شخصیت کا احوال مطالعہ'' کی اشاعت پر آپ نے ۱۲۶کتوبر ۲۰۲۰ء کو جو تہنیتی خط لکھا، مثال کے طور پر یہاں اس کے چند جملے پیش کئے جارہے ہیں۔ اس سے آپ کے اسلوب نگارش کی ندرت، چاشنی اور مزاح کا لطیف اشارہ ملتا ہے:

> ''لانبا عرصہ شوق دید میں گزرا، اب مرحلہ زیارت ہے۔ جناب مولانا محمد عمر بن محفوظ صاحب رحمانی کی کرم فرمائی سے کل یہ کتاب مونگیر پہنچی اور میرے سامنے آئی۔ انہوں نے کرم یہ کیا کہ پچیس جلدیں مزید مجھے بھجوادیں تاکہ

باذوق مفت خوروں تک پہنچ جائیں۔آپ نے بہت بڑا کام کیا اور اناسی تجربہ کار۔''

ان کے علاوہ متعدد کتابوں کے مقدمے تحریر کئے۔شخصیات پر بھی آپ نے تحریریں لکھی ہیں جو ادبی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

خطوط کے علاوہ مولانا کی تصانیف کی تعداد ۲۸ ہے جو سیاست، قانون کے موضوعات کے علاوہ سماجی، قانونی، دینی، اصلاح وسوانحی نوعیت کی ہیں۔آپ کی مشہور رسائل میں ''بیعت عہد نبوی میں''، ''آپ کی منزل یہ ہے''، ''شہنشاہ کونین کے دربار میں''، ''دینی مدارس میں صنعت وحرفت کی تعلیم ''لڑکیوں کا قتل عام''، ''تصوف اور حضرت شاہ ولی اللہ''، ''بمبئی ہائی کورٹ کا تازہ فیصلہ، عدالتی روایات کے پس منظر میں''، ''کیا ۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی تھی''، ''حضرت سجاد۔مفکر اسلام''، ''مفت اور لازمی حصول تعلیم بچوں کا قانونی حق''، ''مسلم پرسنل لا بورڈ اور ہندوستانی قانون''، ''یادوں کا کارواں''، ''اقلیتوں کی تعلیم اور حکومت ہند کو چند عملی مشورے''، ''اقلیتی تعلیمی ایکٹ، مختصر جائزہ''، ''صبح ایک زندہ حقیقت ہے۔یقینی ہوگی''، ''اصلاح معاشرہ کی شاہ راہ اور اپنے بچوں کی تعلیم کا عمدہ انتظام کیجئے'' اہم اور مقبول عام ہیں۔ان سے علمی گہرائی، حالات حاضرہ، قانونی نکات پر زبردست گرفت اور تحریری اسلوب کی انفرادیت واضح ہوجاتی ہے۔

حضرت کے خطوط سادہ، عام فہم، سہل، آسان اور سلیس ہوتی تھی۔آپ دور جدید کے ممتاز صاحب انشاپرداز ادیب تھے، خشک سے خشک موضوع کو بھی ادبی پیرائے میں اس قدر دلچسپ اور خوشنما انداز میں بیان فرماتے کہ قاری آپ کے جملوں اور استعارات سے مستفید ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔حضرت علیہ الرحمہ کو زبان وبیان پر پوری گرفت تھی، اس کا اعتراف وقت کے مفکر، مدبر، مؤرخ، عربی ادب کے ماہر باکمال ادیب حضرت مولانا علی میاں ندوی نوراللہ مرقدہ نے بھی کیا تھا۔

دو انتہائی جامعیت، قطعیت، عالمہ شان وشوکت، پروقار انداز اور طنطنہ میں شرکا وسامعین کو خطاب کیا کرتے تھے۔ان کے خطوط کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موضوع وعنوان کے تحت ساری باتیں ترتیب داران کے ذہن میں محفوظ ہیں اور وہ یکے بعد دیگرے ان باتوں کو پوری مضبوطی کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

مولانا کی گفتگو مدلل ہوا کرتی تھی، وہ دوٹوک انداز میں اپنی بات رکھنے کے قائل تھے۔ان کے الفاظ ابہام گوئی سے پاک ہوتے تھے، وہ راست طور پر سامعین وناظرین سے مخاطب ہوتے تھے۔ان کے جملوں میں تکرار نہیں دیکھی جاتی تھی، وہ الفاظ کے انتخاب میں بھی محتاط رہتے تھے، مولانا کا مطالعہ گہرا تھا، حافظہ کی قوت نے مطالعہ کو پختگی بخشی تھی، جس کی جھلک ان کی تقاریر میں نمایاں تھی۔مولانا کی تقاریر کے خاص

R.N.I. : BIH URD/2019/78036

CS CamScanner



موضوعات حالات حاضرہ، مسلم پرسنل لا، تعلیم وتربیت، بحثیت مسلمان ہماری ذمہ داریاں، بحثیت اقلیت اس ملک میں ہمارے کرنے کے کام، قرآن وسنت کی پیروی وغیرہ ہوا کرتے تھے۔

مولانا اس ملک میں مسلمانوں کے ایک مضبوط وکیل مانے جاتے تھے۔وہ نہایت مضبوطی اور ذمہ داری کے ساتھ مسلم مسائل کو پیش کرتے تھے۔اپنے خطوط کے ذریعہ وہ مسلمانوں کو عزم وحوصلہ دینے کی کوشش کرتے تھے اور حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔وہ کبھی بھی باطل نظام سے سمجھوتہ کے قائل نہ تھے۔مولانا رحمتہ اللہ علیہ جہاں اپنے خطابات میں حکومت کی غلط روشوں کی پول کھولتے وہیں بے باکی کے ساتھ خود مسلمانوں کو آئینہ دکھانے کا کام کرتے تھے۔مولانا رحمتہ اللہ علیہ ملک کے طول وعرض میں بگڑتے حالات سے ہمیشہ متفکر رہے۔ایک جانب جہاں انہوں نے ظالم قوتوں کو للکارا وہیں ہمیں اپنے گریباں میں جھانکنے کی تلقین کی۔ہماری کوتاہیوں کی نشاندہی کی اور راہ راست پر آنے کی دعوت دی۔

مولانا بھی پیغمبر اسلام کی اس تعلیم کے پیروکار تھے جس میں علم کو ترقی وکامرانی کی شاہ کلید قرار دیا گیا ہے۔مولانا کا اس بات پر اصرار تھا کہ مسلم قوم ہر علم کے حصول میں دوسرے قوموں سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ان کا کہنا تھا کہ ہمیں اپنے طور پر بھی محنت کرنی ہے اور جو کچھ ہم کر سکتے ہیں اس ضمن میں ہمیں ضرور کرنا چاہئے۔مولانا نے قرآن وسنت کی پیروی کے ساتھ عملی تدابیر پر ہمیشہ زور دیا۔ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے کے وہ ہرگز قائل نہ تھے۔انہوں نے بڑی صاف گوئی کے ساتھ امت کے ذمہ داروں کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ آپ اپنے دست پا مو کی اہمیت کو تسلیم کیجئے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بخشا ہے اس کی نعمتوں کو اس اعتبار سے عالم کیجئے جو آپ کے حق میں بھی مفید ہو، ملک کے لئے بھی فائدہ مند ہو اور پوری انسانیت اس سے مستفیض ہو۔اس ضمن میں تعلیمی اداروں کے قیام کی جانب انہوں نے بذات خود عملی قدم بڑھایا اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی۔اس ضمن میں آپ نے خطوط کا کافی حد تک سہارا لیا۔مندرجہ بالا تمام باتوں کی روشنی میں ہم مولانا کی خطوط نگاری کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

عرف عام میں جسے خطوط نویسی اور مکتوب نگاری کہا جاتا ہے، فی الحقیقت وہ ایک طرح کی ملاقات اور آپسی گفتگو کا دوسرا نام ہے۔بیان مدعا کی یہ صنف اور کہہ لیجئے کہ اظہار خیال کی یہ صورت اپنے اندر بڑے فوائد اور غری معمولی منفعت رکھتی ہے، بعض مرتبہ ایک مقرر اور خطیب اپنے مخاطب کو جن حقائق سے روشناس نہیں کرا پاتا، یا یوں کہہ لیجئے کہ جن مسائل کی تفہیم وتشریح اس کے لئے آسان نہیں ہوتی، ایک مکتوب نگار باآسانی مکتوب الیہ کو وہ سب کچھ خط کے دو ایک صفحات میں وضاحت سے سمجھا دیتا ہے۔اسی طرح بعض دفعہ ذہن میں پیدا ہونے والے حالات اور پیش آمد ومسائل کے حل کے لئے ہم کسی قابل ذکر شخصیت اور ممتاز صاحب علم ہستی کا انتخاب کرتے ہیں تاکہ سوالات حل ہوسکیں اور مسائل کی گتھی سلجھ سکے،

ISSN : 2582 - 3612

لیکن اظہار مافی الضمیر کرتے وقت کبھی زبان لڑکھڑاتی ہے اور کبھی پست ہمتی سدراہ بن جاتی ہے، دراصل یہ اس شخصیت کا رعب ہوتا ہے جس سے ہم متاثر ہوتے ہیں، جبکہ خطوط کے واسطے سے مشکل سوالات اور حل طلب مسائل کو ہم پوری وضاحت اور خوش اسلوبی سے بیان کر دینے پر قادر ہوتے ہیں۔ شعر کے مصرع اول میں تصوف کے لئے شاعر سے معذرت خواہ ہوں۔

زبان خامہ تو ہی ان سے میرا مدعا کہہ دے
مرے منہ سے تو حرف آرزو مشکل سے نکلے گا

کسی اچھے مکتوب نویس کا رائے سخن جب اپنے بزرگوں، عزیزوں، رفیقوں یا دیگر متعلقین کی جانب ہوتا ہے تو بعد منزل کے باوجود انہیں خود سے قریب پاتا ہے، مگر یہ نزدیکی بقدر تعلق ہوتی ہے، تعلق جس قدر خلوص ومحبت پر مبنی ہوگا، نزدیکی اسی قدر بڑھتی چلی جائے گی۔ ایسا نہیں ہوتا کہ خطوط نویس کی بزم صرف لفظ و بیان اور قرطاس وقلم کی بدولت با رونق ہو جاتی ہے، بلکہ اس کے تصور وتخیل کی مقناطیسی کشش بالآخر مخاطب کو بھی انجمن میں کھینچ لاتی ہے، بظاہر مکتوب الیہ یقیناً شریک بزم نہیں ہوتا، بایں ہمہ سینکڑوں بلکہ بعض مرتبہ ہزاروں میل کی دوری کے باوجود اس انجمن سے علیحدہ بھی نہیں ہوتا، لکھنے والا اپنی چشم تصور سے مخاطب کو دیکھتا ہے اور بے تکلف اس سے ہم کلام ہوتا ہے، زبان دہن سے نہ سہی زبان قلم سے وہ اپنے تمام احساسات وواردات اور احوال وواقعات کبھی اجمال واختصار سے اور کبھی بسط وتفصیل سے بیان کر جاتا ہے۔

**Sadique Hussain**
Research Scholar
Dept. of Urdu Urdu
L .N .Mithila University
Darbhanga (Bihar)

**Dr. Md. Nasimuddin**
Asst. Professor
Dept. of Urdu
Mahatma Gandhi College
Darbhanga (Bihar)

:

R.N.I. : BIH URD/2019/78036

CS CamScanner



نورالہدیٰ

# ادب میں سماجی مسائل کی عکاسی

ادب اور سماج کا رشتہ لازم وملزوم کے درجہ میں ہے۔ سماج کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسان کی تاریخ۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل اور ادھورا ہے، لیکن صرف انسانی ہجوم کو سماج کا نام نہیں دیا جا سکتا، سماج تو افراد کا ایک دوسرے کے ساتھ وابستگی اور تعلق کا نام ہے بقول ایمن انصاری:

''سماج دراصل ان رشتوں کا نام ہے جو افراد کو ایک دوسرے سے منسلک رکھتے ہیں، دوسرے لفظوں میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سماج ان سماجی، تہذیبی، روحانی یا اخلاقی قدروں کا نام ہے جو فرد کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھتے ہیں، ان سماجی تہذیبی، روحانی، اخلاقی قدروں میں اگر شکست وریخت ہوتی ہے تو سماج بھی شکست وریخت سے دوچار ہوتا ہے، قدروں کی ہر تبدیلی اور تغیر سماج کے تغیر کے تعبیر کیا جاتا ہے سماج میں فرد کی حیثیت ایک اکائی کی ہوتی ہے۔ یہی اکائیاں مل کر سماج کا روپ اختیار کرتی ہیں اس طرح فرد اپنے سماج کا نمائندہ ہوتا ہے، جس طرح ایک عام آدمی اپنے عہد، ماحول اور سیاسی، سماجی اتار چڑھاو کے دائرے میں گھومتا رہتا ہے اسی طرح ایک ادیب بھی ان تمام باتوں سے اثرات قبول کرتا ہے۔''

(ڈاکٹر ایمن انصاری، اردو ناولوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، ص۔ 71)

ادب میں ہر دور کے سماجی مسائل کسی نہ کسی صورت میں ضرور پائے جاتے ہیں ہر ادیب اپنے عہد کے سماجی مسائل سے متاثر ہوتا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''ادب اپنی بنیادی حیثیت میں انفرادی نہیں سماجی ہے جیسے سماج کے بہت سے عمل افراد کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں لیکن اپنی نوعیت میں سماجی ہوتے ہیں اس طرح ادب کا ایک اہم پہلو اس کا سماجی مواد اور موضوع ہے۔''

(پروفیسر احتشام حسین، افکار و مسائل، ص۔ 33)

ISSN : 2582 - 3612

ادیب جس سماج و ماحول میں زندگی گذارتا ہے اس کے سماجی مسائل وعوامل سے بخوبی واقف ہوتا ہے، اس کے تجربات، مشاہدات عام انسانوں کے مقابلے میں الگ مقام رکھتے ہیں اس کی دوربین نظروں سے سماج ومعاشرہ کا کوئی بھی حصہ اوجھل نہیں رہتا۔ بقول ایمن انصاری:

''ادیب جس معاشرے میں سانس لیتا ہے اس کے سماجی عوامل اور معاشی حالات پر اس کی گہری نظر ہوتی ہے، یہ ناممکن ہے کہ اس کی دوررس نگاہوں سے سماج کا کوئی بھی گوشہ پوشیدہ رہ جائے، یہی سماجی شعور اس کی تخلیقات کو اپنے عہد اور ماحول کا ترجمان بناتا ہے۔

اسی سماجی شعور کی بدولت درباروں سے وابستہ رہتے ہوئے بھی وہ عوام کی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو آج میر اور غالب کی شاعری، اور میر امن اور جب علی بیگ سرور کی تخلیقات اپنی معنویت کھو چکی ہوتیں۔''

(ایمن انصاری، اردو ناولوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، ص۔19)

قدیم زمانے میں ادب کو صرف دل بہلانے اور وقت گزارنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا لیکن آج کے زمانے میں ادب زندگی کا ترجمان ہے یعنی انسانی زندگی کے مسائل اس کا لازمی جُز بن گیا ہے۔ یعنی ادب برائے ادب کے زمرے سے نکل کر ادب برائے زندگی کے مرحلے سے جڑ گیا۔ اس کے پسِ منظر میں مختلف وجوہات کارفرما رہی ہیں۔

سائنس کی ترقی سے نئے حالات پیدا ہوئے، زندگی کے مختلف شعبہ جات میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں، نئے نئے چیلینج سامنے آئے۔ معاشی حالات بدلے۔ اس طرح سے ادب صرف تفنن طبع کا سامان ہی نہیں رہا بلکہ زندگی کا ترجمان ہوگیا۔ شاعری کے موضوعات بھی بدل گئے، حسن و جمال، گل وبلبل، لب ورخسار، ہجر ووصال سے ہٹ کر سماجی، اصلاحی اور بامقصد شاعری ہونے لگی شعرا نے اپنے دور کی اخلاقی پستی اور حکومت کی کمزوری وغیرہ کو بیان کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔ یہی مضامین وموضوعات ہمیں ہندوستان کے دیگر علاقوں کی اردو شاعری میں بھی نظر آتے ہیں۔ جیسے میر جعفر زٹلی، جو ایک ذولسانی شاعر تھا، اس کی کئی نظموں میں اس دور کے حالات کی زبونی و پریشانی کی جھلک موجود ہے۔ اس نے دنیا سے خلوص کے خاتمے اور ہنرمندوں کی مفلوک الحالی پر کہا ہے۔

گیا اخلاص عالم سے، عجب یہ دور آیا
ڈریں سب خلق ظالم سے، عجب یہ دور آیا ہے


CamScanner



نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری، عجب یہ دور آیا ہے
ہنر مندان ہرجائی پھریں در در بہ رسوائی
رذل قوموں کی بن آئی عجب یہ دور آیا ہے

اسی دور کے ایک اور مشہور شاعر حاتم ہیں۔ انہوں نے مندرجہ ذیل اشعار میں مغلیہ سلطنت کے زوال کی وجہ سے ملک میں پھیلی بدامنی کا نقشہ نہایت موثر انداز میں کھینچا ہے۔

جن کے ہاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پاوں
پھرے ہیں جوتے کو محتاج پڑے سرگرداں
جن کے پوشاک سے معمور تھے توشک خانے
سو وہ پیوند کو پھرتے ہیں ترستے عریاں
پرچہ نان کو رکھ ہاتھ میں کھاتے ہیں امیر
جس کو دیکھوں ہوں سو ہے فکر میں غلطاں پیچاں

کچھ لوگ ہیں جو آج بھی اردو کی کلاسیکل شاعری پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ حسن وعشق اور مے ومینا سے ہی سے لبریز ہے، لیکن جن شعرا پر یہ الزام لگایا جاتا ہے ان کے کلام میں سماجی حالات کی تصویریں بھی موجود ہیں۔ جیسے اردو کے مشہور قصیدہ گو شاعر سودا کے شہر آشوب کے یہ اشعار۔

کیا میں بتاوں کہ زمانے میں کئی شکل
ہے وجہ معاش اپنی سو جس کا یہ بیاں ہے
گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے
گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر
شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یہاں ہے

اس نظم میں سماج کی ابتری کا وہ نقشہ نظر آتا ہے جو تاریخوں میں اس انداز سے نہیں ملتا۔ شاعر نے مختلف طبقات کی روداد غم جس تفصیل سے بیان کی ہے اسے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ملازم پیشہ، سوداگر، شاعر، مولوی، شیخ اور کاشتکار سب تباہ حال اور مفلس تھے۔ میر نے بھی معاشرے کی بدحالی، بداخلاقی اور بے چارگی کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال

ISSN : 2582 - 3612

پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال
کنجڑے جھینکے ہیں روتے ہیں بقال
ایک تلوار بیچے ہے یک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

کلاسیکی دور کے تقریباً ہر شاعر کے کلام میں اپنی زندگی، ماحول اور معاشرے کی جھلکیاں موجود ہیں۔ ان میں سے کسی نے غزل کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا تو کسی نے قصیدہ کو، کسی نے مثنوی میں کچھ کہا تو کسی نے شہر آشوب میں۔ کسی نے اپنی بات سنجیدہ پیرائے میں کہی تو کسی نے طنز وظرافت سے کام لیا۔ بہر حال زمانے پر سب کی نظر رہی اور اس کی عکاسی میں سب کوشاں رہے۔ ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامے کا ذکر غالب فرماتے ہیں۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہر ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی کو دیکھ کر سرسید احمد خان اور ان کے ساتھیوں نے مسلمانوں میں اصلاح کی کوششوں کا آغاز کیا ان کی نظر میں اس کا اہم سبب تعلیم سے دوری ہے۔ علی گڑھ تحریک کی وجہ سے اردو ادب میں بھی ایک جدید دور کا آغاز ہوا۔ یعنی ادب برائے زندگی کے نظریے کو شعوری طور پر شعرا اور ادبا نے اختیار کیا۔ لاہور میں انجمن پنجاب قائم کی گئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شعرا کو موضوعاتی شاعری کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اس انجمن کے زیر اہتمام کسی نہ کسی موضوع پر مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے اور شعرا ان میں میں اپنی نظمیں سنایا کرتے تھے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کوشش مسدس حالی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے کئی اہم موضوعات پر نظمیں تصنیف کیں۔ ایک نظم میں کہتے ہیں۔

قلب ماہیت میں انگلستان گر ہے کیمیا
کم نہیں کچھ قلب ماہیت میں ہندوستان بھی
آن کر آزادیاں آزاد رہ سکتا نہیں
وہ رہے ہوکر غلام اس کی ہوا جن کو لگی

''انقلابی تبدیلی کی دوسری منزل سرسید کی تحریک ہے، جس نے حالی کو پیدا کیا



CamScanner



اور حالی نے غزل کی دنیا ہی بدل دی۔ حالی نے غزل کو پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا اور اس طرح نئے امکانات کا شعور اس میں پیدا کیا۔ حالی نہ ہوتے تو غزل جدید رجحانات سے ہمکنار ہونے کے لیے ترقی کی منزلیں اتنی تیزی کے ساتھ طے نہ کر پاتی۔''

(جدید شاعری، عبادت بریلوی)

مختصر یہ کہ اردو شعرا نے ابتدا ہی سے سماجی مسائل کی عکاسی کی ہے۔ لیکن اگر کوئی دور حاضر کو نظر میں رکھتے ہوئے، ان کے کلام کا جائزہ لے گا تو اسے یہ عنصر بہت کم دکھائی دے گا۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس دور کے سماجی وسیاسی حالات کی روشنی ہی میں ان کے کلام کا جائزہ لیا جائے۔

اردو ادب کی نثری اصناف میں بھی انسان اور انسانی سماج کے موضوع کو کثرت سے برتا گیا۔ داستان، ناول، افسانہ، رپوتاژ، صحافت، ان سب کا محور انسان ہی ہے۔ بوستانِ خیال، طلسم ہوشربا، باغ وبہار، آرائش محفل، فسانہ عجائب، رانی کیتکی کی کہانی میں انسانی تہذیب ومعاشرت کا بیان ہے اور ان میں انسانی قدروں کی باتیں بڑے موثر ڈھنگ سے پیش کی گئی ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد سے لے کر عہد حاضر کے ناول نگاروں تک اور پریم چند سے موجودہ دور کے افسانہ نگاروں تک سب نے اپنا مرکزی موضوع انسان کو ہی بنایا ہے۔

اردو میں باضابطہ ناول نگاری کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد سے ہوتا ہے۔ مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، فسانۂ مبتلا اور ایامیٰ ان کے قابل ذکر ناول ہیں۔ نذیر احمد نے مراۃ العروس میں دراصل انسان کی اچھائی اور برائی کو اکبری اور اصغری کے توسط سے پیش کیا ہے۔ مراۃ العروس میں نذیر احمد نے ایک جگہ لکھا ہے:

''جو آدمی دنیا کے حالات میں کبھی غور نہیں کرتا اس سے زیادہ کوئی احمق نہیں۔ غور کرنے کے واسطے دنیا میں ہزاروں طرح کی باتیں ہیں لیکن سب سے عمدہ اور ضروری آدمی کا اپنا حال ہے کہ جس روز سے آدمی پیدا ہوتا ہے، زندگی میں اس کو کیا کیا باتیں پیش آئیں اور کیونکر اس کی حالت بدلی۔''

(مراۃ العروس، نذیر احمد، کتابی دنیا، نئی دہلی 2003، ص۔5)

ڈپٹی نذیر احمد کا ناول مراۃ العروس میں عورتوں کو برابری کا درجہ دیتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اس میں جن حقوق کا ذکر عورتوں کے حوالے سے آیا ہے، وہ حقوق عورتوں کو ضرور ملنی چاہیے۔ آج خواتین کے حقوق اور تعلیم کی بات بھی کی جا رہی ہے اور اس تعلق سے عملی قدم بھی اٹھائے جا رہے ہیں، مگر نذیر احمد کئی سو سال قبل

ISSN : 2582 - 3612

اپنے ناولوں کے ذریعے خواتین کی تعلیم اور حقوق کی آواز اٹھا چکے ہیں۔

اگر اردو افسانہ نگاری کی بات کریں تو بڑے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اردو میں افسانہ نے زبردست ترقی کی ہے اور اس کا یہ سفر ہنوز جاری ہے۔ اردو کے پہلے افسانہ نگار پریم چند ہیں۔ جنھوں نے بہت سے افسانے لکھے، انھوں نے اپنے زیادہ تر افسانوں میں سماج کے دبے کچلے طبقات وافراد کی زندگی اور مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ کفن اور عیدگاہ جیسے ان کے افسانے ذہن پر لگی زنگ کو ہٹا دیتے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''دراصل پریم چند کے دل میں سماج کے دبے کچلے ہوئے غریب انسانوں کے لیے بے پناہ ہمدردی تھی۔ اب یہ حقیقت ان پر روشن ہوگئی تھی کہ مہاجنوں یا زمینداروں کا قلب ماہیت کر کے کروڑوں غریب انسانوں کی غریبی دور نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں کے خلاف انسانی ضمیر کو بیدار کیا جائے۔ نجات، دودھ کی قیمت اور کفن ایسی کہانیاں ہیں جن میں پریم چند کی حقیقت پسندی زندگی کی المناک سچائیوں کو برہنہ کر کے پیش کردیتی ہے۔ ان میں جو کردار دکھی منگل، گھیسو، مادھو، وہ اس سماج میں جانوروں سے بھی زیادہ گھناونی آمیز زندگی بسر کرنے پر مجبور رہے ہیں۔''

(پریم چند کے نمائندہ افسانے، مرتبہ: قمر رئیس، ص۔22)

اردو افسانہ نگاروں میں منٹو کی عظمت سے کسی بھی صورت انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے افسانوں کی مقبولیت آج بھی برقرار ہے۔ زندگی کو جس طرح سے منٹو نے پیش کیا ہے، وہ دراصل انہی کا خاصہ ہے۔ ان کے افسانوں میں انسان کا درد سامنے آتا ہے۔ ان کا انداز اچھوتا ہے اور بلا کی تاثیر رکھتا ہے۔ تقسیم وطن کے حوالے سے بہت سے افسانے لکھے گئے، مگر ٹوبہ ٹیک سنگھ کی بات ہی کچھ اور ہے۔ منٹو نے اپنے کئی افسانوں میں طوائف کے مسائل کو بھی بیان کیا ہے۔ اور سماج میں ہونے والی ناانصافی اور زیادتی کو انھوں نے کھول کر رکھ دیا ہے۔ گوپی چند نارنگ منٹو کے بارے میں لکھتے ہیں :

> ''جو چیز منٹو کے تخلیقی ذہن میں اضطراب پیدا کرتی ہے وہ خریدی یا بیچی جانے والی جنس نہیں بلکہ انسانی روح کا وہ درد وکرب ہے، جو جسم کو بکاو مال بنانے سے پیدا ہوتا ہے۔''

(افسانوں کے درمیان، محمد اسلم پرویز، ص۔48-49)

اردو کی خواتین افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی کا نام زیادہ اہم ہے۔ انھوں نے عورتوں کے



CamScanner



مسائل کو زیادہ بیان کیا ہے بالخصوص متوسط مسلم گھرانے کی عورتوں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ عصمت چغتائی ترقی پسند تحریک سے باضابطہ وابستہ رہی ہیں، اس لیے ان کے افسانوں میں ترقی پسند خیالات کے عناصر بخوبی ملتے ہیں۔ پریم چند، اوپندرناتھ اشک، کرشن چندر، منٹو، بیدی اور عصمت چغتائی کے علاوہ دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی انسان کا تصور ملتا ہے۔ گویا کہ ہر ادیب انسان کے اردگرد سے ہی اپنی تخلیقات کا مواد فراہم کرتا ہے اور انسانی سماج کی تشکیل وتعمیر میں اپنا تعاون پیش کرتا ہے۔

**Nurul Hoda**
Reseach Scholar
Department. of Urdu
B. N. Mandal University
Madhepura (Bihar)
Mob.- 89794 17807

ISSN : 2582 - 3612

محمد کلیم الدین

# اردو کی ارتقا میں سولہویں صدی کے صوفیا کا کردار

اردو زبان وادب کی تخلیق ونشو ونما میں صوفیائے کرام کا بڑا حصہ ہے۔ انہیں اپنی بات عوام تک پہنچانا تھا۔ وہ ایسی زبان میں اپنی تعلیمات پیش کرنا چاہتے تھے جسے عوام سمجھ سکیں۔ اس لئے انہوں نے اردو زبان کو عوام کی تبلیغ یعنی اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے منتخب کیا۔ یہ زبان سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ ہر زبان کے ادب میں نظم پہلے آتی ہے۔ نثر بعد میں۔ اردو ادب کی ابتدائی صدیوں میں نظم کے مقابلے میں نثر بہت کم ملتی ہے۔ اردو نثر کے فقرے اور جملے با قائدہ نثری کتابوں سے پہلے صوفیا کے ملفوظات میں ملتے ہیں۔ صوفیائے کرام کے یہ فقرے اردو کے نقوشِ اولین ہیں۔ یہ فقرے اردو زبان کی ارتقا میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔

صوفیا کا عوام سے براہِ راست تعلق تھا۔ اس لئے وہ اُسی زبان کو ذریعہ ابلاغ بنانا چاہتے تھے جو اس وقت عوام میں رائج تھی۔ صوفیائے کرام عوام سے ان کے اپنے روزمرہ کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ ہندوستانی مقامی زبانوں اور بولیوں کو بادشاہوں کے دربار میں اتنی سرپرستی اور حوصلہ افزائی نہیں ملی جتنی بزرگوں کی خانقاہوں سے حاصل ہوئی۔ اُمرا اور بادشاہوں کو عوام سے میل جول کی وہ ضرورت نہیں تھی جو ان بزرگوں کو تھی۔ یہی ہندوستانی مقامی زبان قدیم اردو تھی جو اس وقت عوام میں رائج ضرور تھی لیکن فارسی کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ تصنیف وتالیف میں فارسی ہی کا استعمال تھا۔ یہ صوفیا ہی تھے جن کی بدولت یہ قدیم اردو رشد وہدایت، پند وموعظت کا موثر ذریعہ بن گئی جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس زبان میں فکر وفن کے اظہار کی اچھی صلاحیت پیدا ہوتی گئی۔

صوفیائے کرام نے اس زبان کو تصوف کی تعلیم کے لئے استعمال کیا۔ سوال و جواب کی ہیئت میں نظمیں لکھی گئیں جو ایک عام اور مقبول ہیئت رہی۔ سوال و جواب میں شریعت وطریقت کے بہت سے مسائل آ گئے۔ نثری رسالے لکھے گئے۔ قوالی، موسیقی، شاعری اور درس اِخلاق کی یہی زبان رہی۔ صوفیا نے اسے ادبی سطح پر لانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

اس دور میں اردو جب کہ نومولود زبان تھی اور اہلِ علم اس میں لکھنا باعثِ عار سمجھتے تھے، صوفیائے



CS CamScanner



کرام نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کی تعلیم، تربیت اور تلقین کے لئے اسی زبان میں شعری اور نثری تخلیقات پیش کیں۔ ان تخلیقات میں معرفت وسلوک، مذہب، علم وحکمت جیسے موضوعات شامل تھے۔ اپنے پیغام کے لئے انہوں نے شاعری کا سہارا لیا۔ چنانچہ اردو زبان میں شاعری کے قدیم نمونوں میں تصوف کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ یہاں ابتدائی دور سولہویں صدی یعنی 1500ء سے 1600ء تک کے قدیم دور میں صوفیائے کرام نے جو خدمات انجام دی ہیں، ان میں سے کچھ مخصوص صوفیائے کرام کی خدمات کا ایک مختصر جائزہ پیش ہے۔

شیخ بہاء الدین باجنؒ :۔ شیخ بہاء الدین باجن، شیخ عزیز اللہ المتوکل علی اللہ کے مرید تھے۔ باجن جب حج کے لئے روانہ ہوئے تو ان کے مرشد کا انتقال ہوگیا۔ ان کے مرشد ہدایت کر گئے کہ باجن کی واپسی کے بعد انہیں خرقہ ولایت اور تبرکات دے دیئے جائیں۔ ان کی ہدایت پر عمل کیا گیا۔ باجن سیاحت کرتے کرتے برہان پور پہنچے اور وہیں مقیم ہوئے۔ آپ کی ایک کتاب ''خزانہ رحمت'' مشہور ہے۔ یہ کتاب فارسی نثر میں ہے لیکن باجن نے جا بجا اپنا اردو کلام بھی پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنے پیر ومرشد کے ملفوظات اور ارشادات جمع کئے ہیں۔ باجن شاعر بھی تھے۔ آپ کا کلام تصوف کے مضامین سے لبریز ہے۔ باجن نے اپنے پورے کلام کو 'جکری' قرار دیا ہے۔ ''جکری'' کا تعلق چشتیہ سلسلے سے ہے۔ 'جکری' ذکری کی گجری شکل ہے، جس میں بنیادی طور پر ذکرِ خدا، ذکرِ رسول ﷺ، ذکرِ پیر ومرشد، ذکرِ تجربات باطنی وواردات روحانی کو عام فہم انداز میں لکھا جاتا تھا جن سے مریدوں اور طالبوں کی ہدایت ہوتی تھی۔ باجن کا انتقال ۹۱۲ھ مطابق 1506ء میں برہان پور میں ہوا۔

شاہ علی محمد جیوگام دھنیؒ :۔ شاہ علی محمد جیوگام دھنی گجرات کے بلند پایہ عارف اور صوفی تھے۔ ''گاؤں دھنی'' آپ کا لقب تھا۔ یعنی گاؤں کا مالک۔ اسی کو قدیم تلفظ سے 'گام دھنی' کہا گیا۔ اہلِ گجرات پر آپ کی تعلیم اور ہدایت کا بڑا اثر ہوا۔ آپ کا مجموعہ کلام 'جواہر اسرار اللہ'' توحید اور وحدت الوجود سے بھرا پڑا ہے۔ تمام موجودات کو خدائے تعالیٰ کا ایک وجود ماننا وحدت الوجود ہے۔ آپ کا کلام خدائے تعالیٰ کی محبت سے لبریز ہے۔ مولوی عبدالحق فرماتے ہیں :

> ''وہ عاشق ہیں اور خدا معشوق ہے اور اپنی محبت کو طرح طرح سے جتاتے ہیں۔ طرز کلام ہندی شعرا کا سا ہے اور عورت کی طرف سے خطاب ہے۔ زبان سادہ ہے لیکن چونکہ پرانی ہے اور غیر مانوس الفاظ استعمال کیے گئے اس لئے کہیں کہیں سمجھنے میں مشکل پڑتی ہے۔''
>
> (اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص۔ ۵۸)

آپ کی وفات ۱۴ جمادی الاول ۹۷۳ھ مطابق 1565ء کو ہوئی۔ آپ کا مزار احمد آباد میں اندرونِ حصار دروازہ، رائے گڑھ میں ہے۔

شاہ برہان الدین جانمؒ:۔ برہان الدین جانم شاہ میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ 15 برس کی عمر تک تحصیل علم میں مصروف رہے اور علم ظاہری میں کمال حاصل کیا۔ اس کے بعد علم باطنی کے حصول کے لئے اپنے والد میراں جی شمس العشاق کے ہاتھ پر بیعت کی۔ والد کی تعلیم و تربیت سے جانم بہت جلد ایک جید عالم اور صوفی بن گئے۔ جانم اپنے والد کی طرح رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی روایت کو اپنایا اور جنوبی ہند میں رشد و ہدایت کے فیض کو اپنی تصانیف کے ذریعے سے جاری رکھا۔ ''تاریخ ادب اردو'' (جلد اول) میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں :

''جانم کی دو خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے فلسفہ وجود کو مرتب کر کے اُسے ایک با قائدہ شکل دی اور آب و آتش، خاک و باد کے تعلق سے وجود کا مطالعہ کر کے اُس کے چار مدارج، واجب الوجود، ممکن الوجود، ممتنع الوجود اور عارف الوجود مقرر کئے۔ دوسری یہ کہ تصوف و اخلاق اور شریعت و طریقت کو اپنی نظم و نثر کے ذریعے پیش کیا۔''

برہان الدین جانم اردو زبان میں تلقین کیا کرتے تھے۔ وہ معرفت و سلوک کی تعلیمات سادہ اور سلیس زبان میں اپنے مریدوں اور معتقدین کو ذہن نشین کرانا چاہتے تھے۔ جانم چشتیہ سلسلے کے اُن بزرگوں میں سے ہیں جن کی تصانیف نے عوام و خواص میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ ارشاد نامہ، وصیت الہادی، سکھ سہیلا، منفعت الایمان، حجت البقاء، بشارت الذکر اور عبرتِ آدم، شعری تصانیف ہیں۔ نثر میں بھی جانم سے بہت سارے رسالے منسوب ہیں۔ ان میں معرفت القلوب، ہشت مسائل اور کلمۃ الحقائق قابلِ ذکر ہیں۔ 'کلمۃ الحقائق' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ قدیم اردو کا اولین نثری کارنامہ ہے جو مکمل حالت میں دستیاب ہوا ہے۔ شاہ برہان الدین جانم کی وفات 1598ء میں ہوئی۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ:۔ عبدالقدوس گنگوہی صاحبِ علم و عمل اور بڑے عالم و صوفی تھے۔ مولوی عبدالحق کا بیان ہے :

''عبدالقدوس گنگوہی شیخ محمد بن شیخ احمد عبدالحق چشتی صابری کے مرید اور صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ وہ ہندی کے شاعر تھے اور الکھ داس تخلص کرتے تھے۔ ان کی ایک تصنیف ''رُشد نامہ'' ہے جس میں تصوف اور وحدت الوجود کے نکات بیان کئے ہیں۔ اس میں جگہ جگہ ہندی دوہرے اپنی تصنیف کے



CamScanner



لکھے ہیں۔ اس میں سے چند نقل کئے جاتے ہیں۔

یہ جُگ ناہیں باج پی بوجھ برہم گیان
سوپانی سو بُلبلا سوئی سرور جان
ایکی او ہوا یکی ماس ایکی سرور ایکی ہانس
گُر مُکھ بوجھ برہم گیان تیں ترلوک ایک کے جان

دھن کارن پی آپ سنوارا
بن دھن سکھی کنت سِنگھارا
کیوں نہ کھیلوں تج سنگ میتا
مُجہ کارن تیں ایتیا کیتا
الکھ داس آکھے سُن ہوئی
سوئی پاک ارتہ پہن ہوئی''

(اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص۔۲۳۔۲۴)

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی وفات ۹۴۵ھ مطابق 1538ء میں ہوئی۔

حضرت شاہ محمد غوث گوالیاریؒ:۔ حضرت محمد غوث گوالیاری سولھویں صدی عیسوی کے بہت بڑے بزرگ اور صوفی تھے۔ بارہ سال تک کوہ چنار کے دامن میں سخت ریاضت کی تھی۔ مغل حکمران ہمایوں آپ کا بڑا معتقد تھا۔ اکبر اعظم بھی آپ کا مرید تھا مگر بعد میں منحرف ہوگیا۔ حضرت غوث گوالیاری کے ہندی قول اور ہندی اشعار قدیم بیاضوں میں ملتے ہیں۔ ''جواہر خمسہ'' آپ کی مشہور کتاب ہے۔ گجرات کے مشہور عالم وصوفی شیخ وجیہ الدین علوی نے آپ ہی سے روحانی فیض حاصل کیا تھا۔ ملفوظات سید ہاشم علوی ''مقصود المراد'' کے اقتباس کو نقل کرتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف ''اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام'' میں لکھا ہے :

''شاہ وجیہ الدین کی تربیت حضرت شاہ محمد غوث نے فرمائی اور علم حقائق سکھایا اور باوجود یہ کہ انہوں نے 22 سال کی عمر میں 120 علم تحصیل کئے لیکن خود شاہ صاحب یعنی شاہ وجیہ الدین فرماتے تھے اگر میں شیخ سے ملاقات نہ کرتا تو میں مسلمان نہ ہوتا۔ اور پھر فرمایا کہ جو معرفت اللہ تمام عمر میں حاصل نہ ہوئی تھی وہ ایک شب میں حاصل ہوگئی۔

ISSN : 2582 - 3612

اس کتاب میں شاہ صاحب کا ایک ہندی قول سید ہاشم کی زبانی
بیان کیا گیا ہے۔ ''بھیکی بچہ خدا کو نہ میلے'' یعنی بھکاری کو خدا نہیں ملتا۔''
(اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص۔۲۵)

حضرت شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کا انتقال 80 سال کی عمر میں ۹۷۰ھ مطابق 1562ء میں آگرہ میں ہوا اور گوالیار میں دفن ہوئے۔

شیخ وجیہ الدین احمد علویؒ:۔ شیخ وجیہ الدین احمد علوی اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور صاحبِ باطن بزرگ تھے۔ آپ نے حضرت غوث گوالیاری سے روحانی فیض حاصل کیا۔ آخری عمر احمد آباد میں درس و تدریس اور تعلیم و تلقین میں گزاری۔ آپ کے مریدوں نے آپ کی کہی ہوئی باتوں یعنی ملفوظات کو کتاب کی صورت میں جمع کیا ہے جس کا نام ''بحر الحقائق'' ہے۔ اس کتاب میں جگہ جگہ ان کے ہندی اقوال درج ہیں۔ آپ کا انتقال ۹۹۸ھ مطابق 1589ء میں احمد آباد میں ہوا۔

غرض اس سولہویں صدی کے تجزیئے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم اردو ادب پر مذہب کا غلبہ تھا۔ خواجگانِ چشت اور دوسرے صوفیائے کرام نے ہندوستان میں اپنی گفتار اور کردار سے ایک ایسا انقلاب پیدا کیا، جس کا اثر ہندوستانی تہذیب و تمدن، افکار و خیالات، علم و ادب، شعر و شاعری غرض زندگی کے ہر شعبے پر ایسا پڑا کہ اس کے آثار اور خد و خال آج بھی نمایاں ہیں۔ یہ تمام صوفیائے کرام اردو کے محسن ہیں۔

**Md. Kalimuddin**
Research Scholar
**Prof, Md. Ashraf Imam**
Supervisor
Department of Urdu
B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur (Bihar)
Mob.- 95074 30891



CamScanner



محمد رضوان

# اردو نظم میں ''ادب برائے زندگی'' کا تصوّر

ادب میں جب ہم نظریات کی بات کرتے ہیں تو فوری طور پر روایت، ترقی پسندی، جدیدیت اور پھر مابعد جدیدیت کا امیج ذہن میں ابھرنے لگتا ہے۔ مندرج نظریات کی توضیح کے لئے ضروی ہے کہ اردو شعر و ادب میں نظریات کے تابع رہ کر لکھی گئی تحریروں کو نظر میں رکھیں۔ بالخصوص ادب کی مختلف اصناف پر روایت کی پاسداری، ترقی پسندی کی ارضیت پسندی، جدیدیت کی جمالیات اور مابعد جدیدیت کی نوتاریخیت پسندی کا اطلاق ہوتا رہا ہے۔ ہر دور میں خس و خاشاک کی طرح تحریریں موجود رہی ہیں۔ ترقی پسندی بھی کمیونزم کے (مینی فیسٹو) منشور کے تابع رہ کر فروغ کی منزلوں سے گذرتی رہی۔ اسے براہ راست طور پر ''تحریک'' کہا گیا جو صدفی صد درست بھی تھا۔ ادب میں عام طور پر دو طرح کے نظریات رائج ہوئے ہیں۔ ایک ادب برائے زندگی اور دوسرا ادب برائے ادب۔ اردو کی روایتی شاعری کو بھی ادب برائے زندگی کے خانے میں رہ کر احتساب کیا جانا چاہیئے کہ اس کا نظریہ بھی صحت مند زندگی گذارنے کا درس دیتا ہے :

''لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو'' کی معنویت کو پیش نظر رکھیں تو
روایتی ادب خواہ وہ منشور و منظوم کسی صنف کے ہوں ان میں زندگی کا عکس
صاف دکھائی دیتا رہا ہے۔''

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد انگریزی حکومت نے اردو شعر و ادب کے بنیادی ماخذات کے تراجم پیش کئے۔ ان ترجموں کی اہمیت اس لئے زیادہ تھی کہ وہ شعر و ادب کے مزاج اور مقاصد کو اچھی طرح سمجھنا چاہتے تھے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کی تہذیبی، تاریخی، سماجی انسلاکات کی تفہیم سے کوسوں دور رہتے۔

اردو ادب کے ناقدِ اول مولانا الطاف حسین حالی نے 'مقدمہ شعر و شاعری' لکھ کر تخلیق کی غرض و غایت مؤثر طریقے سے بیان کی ہے۔ اس مقدمے نے اردو شاعری کے خد و خال افکار و خیالات، اور اس کے مقاصد کو اس طرح بیان کیا کہ ان کی یہ کتاب تا قیامت حوالے کے طور پر پیش کی جاتی رہے گی۔ میری

ISSN : 2582 - 3612

دانست میں ادب کا تعلق لامقصدیت سے کبھی نہیں رہا ہے۔ چاہے وہ نیچرل شاعری کے نام پر ہو یا ترقی پسندی کے نام پر یا پھر اب جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نام پر۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ سرسید کی علی گڑھ تحریک یوں ہی کامیاب نہیں ہوئی بلکہ ان کے بہی خواہ خاص الطاف حسین حالی کے مقدمے نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ جس مسدس حالی کو سرسید نے اپنے لئے توشۂ آخرت قرار دیا ہو اس کی سماجی ، ادبی، تہذیبی افادیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے؟

حالی نے اردو شاعری کو اصلاحِ معاشرہ کیلئے Tool کی طرح استعمال کرنے کی وکالت کی ہے۔ اب میں اپنی بات کو اردو کی روایتی نظمیہ شاعری کے حوالے سے آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے درج ذیل اقتباس کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو اردو نظم کی روایتی شاعری کی مقصدیت سامنے آسکے گی :

> ''سرسید، آزاد اور حالی نے شعر و ادب میں جس تبدیلی کی راہ دکھائی اس کی روشنی میں ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس تحریک کا بنیادی جواز کیا تھا؟ ادبی، نفسیاتی، سماجی، تعلیمی یا سیاسی؟ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبدیلی کی اصل وجہ خالص ادبی تھی۔ سرسید، آزاد اور حالی نے عام اردو شاعری کو زوال آمادہ قرار دیا تھا۔ اور ضرورت محسوس کی تھی کہ شاعری کو ایک ایسا رُخ دیا جائے جس سے یہ کار آمد صنعت کی حیثیت اختیار کر سکے۔ ان حضرات نے شاعری میں موضوعات کی تبدیلی کی بات کی لیکن انجمن کے معاشرے میں یا اس کے زیرِ اثر جس قسم کی نظمیں لکھی گئیں ان کی روایت نظیر کے یہاں پہلے سے تھی۔ مظاہر فطرت سے متعلق نظمیں نظیر کے علاوہ مثنوی میں اور کسی قدر مرثیے میں اہم جُز کی حیثیت سے موجود تھیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مرثیے اور مثنوی میں فطرت کے حسین مرقے ملتے ہیں۔ یہ ضرور ہوا کہ آزاد اور حالی نے اس مخصوص طرز کو تحریک کی شکل دی اور شاعروں کو چند مخصوص موضوعات پر نظمیں لکھنے کی تلقین کی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ موضوعات کسی نہ کسی شکل میں پہلے سے ہی اردو شاعری کا حصہ تھے۔''

(''جدید اردو نظم نظریہ و عمل''، مصنف عقیل احمد صدیقی مضمون جدید نظم کی پیدائش ص۔21-22)

مندرج اقتباس پیش کرنے کی غرض و غایت یہ ہے کہ اردو نظم کا ارتقائی سفر ادب برائے زندگی کی وسیع معنویت کو پیش نظر رکھ کر ہی طئے ہوا تھا۔ اس ضمن میں کسی بھی زبان کے فروغ و ارتقاء کے سلسلے میں لینن



CS CamScanner



نے ادب کو تاریخ سے دو قدم آگے چلنے کی بات کہی تھی۔ یہ نظریہ اس لئے بھی گلے اترتا ہے کہ ادب تاریخ کا جز ضرور ہے لیکن یہ ایسا واقعاتی و سانحاتی تذکرہ نہیں ہے جس میں فلسفیانہ خشکی پائی جاتی ہو۔ ادب کسی بھی طرح کی پیشین گوئی نہیں کر سکتا کہ اس میں زندگی کا عکس ضرور دکھائی دیتا ہے لیکن زندگی کے مسائل کو کیسے حل کیا جائے اس نکتے پر وہ فوری طور پر حتمی رائے نہیں پیش کر سکتا۔

اردو کی مقبول ترین صنف سخن نظم نگاری کی صحت مند روایات کا مطالعہ کئے بغیر نہ تو ترقی پسند شاعری کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ جدیدیت کی افہام و تفہیم کے مرحلے سے گذر سکتے ہیں۔ نظم کا دائرہ بہت وسیع ہے اس کے تحت پابند نظم، معری نظم اور آزاد نظم کا پیکر ذہن میں ابھرتا ہے۔ اقبال، جوش، جگر، فیض، مخدوم، مجاز سب پابند نظم نگار تھے ۔ جذبی، وامق جونپوری تک اردو کی ترقی پسند نظمیں فن و فکر کی حسین آمیزش رکھتی تھیں۔ مسرور جعفری نے ایشیا جاگ اٹھا میں بین الاقوامی تشدد کے خلاف جس طرح آواز بلند کی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اردو ترقی پسند نظم نگاری کا زمانہ کئی حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا آزادی کے حصول کے لئے پر جوش، لہجے، نظمیں، انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے والی گھن، گرج والی نظمیں اور اس کے بعد فرقہ فرقہ پرستی، عدم مساوات، جبر و استحصال، تقسیم وطن کے المیے کو بیان کرتی نظمیں، ترقی پسند تحریک کو قوتِ گویائی بخشتی رہی ہیں اس ضمن میں فیض احمد فیض کی نظم سب سے بطور حوالہ پیش کر رہا ہوں۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ اب جاں تک تیری ہے
دیکھ کے آہن گر کی دکان میں
تند ہے شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن

اب سردار جعفری کی نظم ''صبح فردا'' سے ایک بند بھی پیش کر رہا ہوں جس میں ناامیدی کے خلاف نئے استعارے اور نئی تشبیہوں نے گہری معنویت پیدا کی ہے۔

یہ سرحد پھول کی خوشبو کی رنگوں کی بہاروں کی
دھنک کی طرح ہنستی ندیوں کی طرح بل کھاتی

ISSN : 2582 - 3612

وطن کے عارضوں پر زلف کے مانند لہراتی
مہکتی جگمگاتی اک دلہن کی مانگ کی صورت
کہ جو بالوں کو دو حصوں میں تو تقسیم کرتی ہے
مگر سیندور کی تلوار سے صندل کی انگلی سے

منقولہ دونوں نظموں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ زندگی کے دکھ کے پہاڑ کو کاٹ کر شاداب جھیلوں کی نمائش کا اہتمام خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

شعروادب کا ادنیٰ سا طالب علم جانتا ہے کہ فیض احمد فیض نظموں میں مارکسی جمالیات کی تہہ میں اتر کر گوہرِ آبدار برآمد کرنے میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔معاملہ یہ بھی ہے کہ ترقی پسند نظموں میں مارکسی جمالیات کی ایک نئی حِس پیدا کرنے میں یہ کامیاب رہے ہیں۔فیض کے اس شعر کو ذہن میں بھی رکھیں ۔

مقامِ فیض کسی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

محولہ شعر میں لفظ فیض مخصوص معنی میں مستعمل ہے اسے تخلص کو کھپانے کا سطحی طریقہ نہیں سمجھنا چاہیئے ۔اکثر ناقدین اس شعر کو پڑھ کر مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں کہ لفظ فیض ذو معنی ہے۔

دوسری پیش کش سردار جعفری کی ہے اس میں انہوں نے ترقی پسندی کے فکری نظام کو بلندی عطا کر دی ہے۔ان کی نظر میں سرحد کی تقسیم کاری میں بھی حسن ازل پوشیدہ ہے۔اس کے چند مصاریع پیش کئے جاتے ہیں ۔

یہ سرحد پھول کی خوشبو کی رنگوں کی بہاروں کی
دھنک کی طرح ہنستی ندیوں کی طرح بل کھاتی
وطن کے عارضوں پر زلف کے مانند لہراتی
مہکتی جگمگاتی اک دلہن کی مانگ کی صورت
کہ جو بالوں کو دو حصوں میں تو تقسیم کرتی ہے
مگر سیندور کی تلوار سے صندل کی انگلی سے

محولہ مصرعوں کو ذہن میں رکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ سردار جعفری نے تقسیم ہند کے المیے کو بھی نگاہِ مثبت سے دیکھا ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ ملک کی تقسیم صرف ایک جغرافیائی مسئلہ نہیں ہے بلکہ نظریہ تہذیب و



CamScanner



تمدن کی تقسیم کا بھی مسئلہ ہے۔تقسیم ملک کا المیہ ہندوستان کا مسلمان آج بھی جھیل رہا ہے۔کہا جاتا ہے کہ یہ انگریزوں کا خونیں کھیل کھیلنے کا منصوبہ تھا جو آج تک دل و ذہن کی سرحد پر سنگ میل کی صوت تنازعہ قائم ہے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت تقسیم ملک کے المیے کو آج بھی جھیل رہی ہے۔ہجرت کر کے جو لوگ پاکستان چلے گئے آج بھی ان کے عزیز و اقارب ہندوستان میں موجود ہیں لیکن اس المیے کے مثبت پہلو کو سردار جعفری نے اپنے ہی نظریے کی عینک سے دیکھا ہے۔مزے کی بات یہ کہ اپنے مافی الضمیر کو انہوں نے تقسیم و ہجرت کے براہ راست مسئلے کو در کنار کرتے ہوئے چشمِ جمالیات سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔اس نظم کا ہر ایک بند سردار جعفری کے منفرد شاعرانہ تخئیل کو پیش کرتا ہے۔

**Md. Rizwan**
Research Scholar
Department of Urdu
Magadh University
Bodh Gaya (Bihar)
Mob.- 99346 41539

سیّد وسیم اللہ بخاری

# بہار کی خانقاہیں اور مشہور خانقاہوں کی خدمات

بہار ہندوستان کی ایک قدیم اور روحانی اعتبار سے نہایت اہم ریاست ہے۔اس سرزمین نے نہ صرف علم وادب کو فروغ دیا بلکہ صوفیاءِ کرام کی آمد اور ان کے فیوض وبرکات نے اسے روحانی مرکز بھی بنادیا۔ بہار میں کئی عظیم خانقاہیں (صوفی مراکز) قائم ہوئیں، جنہوں نے صدیوں تک روحانی تعلیم، امن، محبت، اور بھائی چارے کا پیغام دیا۔ ذیل میں بہار کی چند اہم اور مشہور خانقاہوں کا تفصیلی تعارف پیش کیا جا رہا ہے:

خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف (پٹنہ) اس خانقاہ کے بانی حضرت سید شاہ مجیب اللہ قادریؒ (وفات: 1632ء) یہ بہار کی سب سے مشہور اور پرانی خانقاہوں میں شمار ہوتی ہے۔ حضرت مجیب اللہ قادریؒ بغداد شریف سے سلسلہ قادریہ کے فیوض لے کر ہندوستان آئے اور پھلواری شریف کو اپنا مرکز بنایا۔ یہاں سے سلسلہ قادریہ کی تعلیمات کو فروغ ملا۔

اس خانقاہ میں عرس کے موقع پر ملک بھر سے بے شمار زائرین کی آمد، اسلامی تعلیمات، ذکر و مراقبہ، لنگر کا نظام۔ جس میں عقیدت منگ پورے جوش وخروش کے ساتھ شامل ہوکر فیوض حاصل کرتے ہیں۔

خانقاہ منگیر یہ، منگیر اس خانقاہ کے بانی حضرت شاہ صدیق اللہ منگیریؒ ہیں۔ یہ خانقاہ سلسلہ نقشبندیہ وقادریہ کی تعلیمات کا مرکز رہی ہے۔ حضرت شاہ صدیق اللہؒ کی روحانی فیض رسانی کے باعث منگیر ایک اہم روحانی مرکز بنا۔ اس خانقاہ میں علمی نشستیں، قرآنی تعلیم، روحانی بیعت، صوفی ادب کا فروغ ہوتا رہتا ہے اس سے بے شمار زائرین اور عقیدت مند عقیدت کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔

خانقاہ معینیہ، پٹنہ، اس خانقاہ کی نسبت خواجہ غریب نوازؒ کے سلسلے سے منسلک ہے، یہ خانقاہ سلسلہ چشتیہ کی نمائندہ خانقاہ ہے۔ اس کا مقصد محبت، رواداری اور انسانیت کا فروغ رہا ہے۔ عرس، سماع کی محفلیں، فلاحی کام، اسلامی وصوفی تعلیم۔

خانقاہ رحمانیہ، مونگیر اس مشہور خانقاہ کے بانی حضرت مولانا شاہ بدرالدینؒ ہیں۔ خانقاہ رحمانیہ بہار میں دینی وروحانی تعلیمات کا ایک مضبوط گڑھ رہی ہے۔ یہ خانقاہ دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کی تعلیمات میں روحانیت کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس خانقاہ کے پیروکار میں مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے نظریات کے ماننے والے افراد کی کثرت ہے۔ یہاں دینی مدرسہ، تصوف کی تربیت،

R.N.I. : BIH URD/2019/78036



اصلاح نفس کی تعلیم وغیرہ دی جاتی ہیں۔

خانقاہ قادریہ برکاتیہ، گیا، یہ خانقاہ سلسلہ قادریہ برکاتیہ کے مشائخ کا مرکز ہے۔ حضرت شاہ برکت اللہ مارہرویؒ کے سلسلے سے منسلک سجادگان نے اس خانقاہ کو فروغ دیا۔ اس خانقاہ کی خصوصیات میں عوامی اصلاح، درس قرآن، عرس ومحافل میلاد، لنگر اور عقیدت مندوں کی روحانی تربیت اور اصلاح کے ذریعے ان کو مستفید کیا جاتا ہے۔

خانقاہ کبیریہ، سہسرام، اس بانی حضرت کبیرالدینؒ یہ ایک صوفی بزرگ کی خانقاہ ہے جو عوامی سطح پر خدمت خلق اور روحانی تربیت میں مصروف رہی۔ سہسرام میں اس خانقاہ کو بڑی عقیدت سے دیکھا جاتا ہے۔ یہاں لائبریری، صوفی ادب کی ترویج، سماجی خدمات اور علمی وادبی سرگرمیاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

صوبہ بہار، ہندوستان کا ایک ایسا خطہ ہے جہاں فارسی زبان وادب کی ایک طویل اور شاندار تاریخ موجود ہے۔ یہاں فارسی زبان وادب نے نہ صرف اپنی جڑیں مضبوط کیں بلکہ ایک ایسی تہذیب کو بھی جنم دیا، جس کے اثرات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ بہار میں فارسی ادب کے فروغ میں خانقاہوں اور مدارس کا اہم کردار رہا ہے۔ یہاں کے صوفیاء اور علماء نے فارسی زبان میں تصوف، فلسفہ، تاریخ اور ادب پر گراں قدر کتابیں لکھیں۔

بہار کے چند اہم فارسی ادبا وشعراء کا تعارف درج ذیل ہے:

شاہ محمد منیر: یہ ایک صوفی شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں تصوف اور عشقِ الٰہی کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کا کلام فارسی صوفیانہ شاعری میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

شاہ عبدالقادر قادری یہ بھی ایک صوفی شاعر تھے اور ان کی شاعری میں بھی تصوف اور معرفت کے مضامین ملتے ہیں۔ *ان کی شاعری میں روحانیت اور اخلاقی اقدار کی عکاسی ہوتی ہے۔

شاہ اکبر داناپوری یہ ایک عالم دین اور شاعر تھے۔ انہوں نے فارسی زبان میں کئی کتابیں لکھیں۔ ان کے کلام میں علمی اور ادبی مضامین کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

شاد عظیم آبادی خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی عظیم آباد (پٹنہ) بہار میں پیدا ہوئے۔ وہ غزل کے منفرد شاعر ومفکر تھے۔ غزل ان کی محبوب صنف سخن تھی مگر انہوں نے دوسری اصناف پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ شاد نے اپنی غزلوں میں عارفانہ اور عاشقانہ موضوعات پر بھی بڑے ہی پرسوز اشعار کہے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے کلام پر تصوف کی گہری چھاپ ہے۔

علی حسین باقی کی پیدائش، سکونت اور جائے مدفن پٹنہ ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہار میں کئی دیگر

ISSN : 2582 - 3612

فارسی ادبا و شعراء ہوئے ہیں جن کا فارسی ادب میں اہم کردار رہا ہے۔مگر یہاں سرِ دست انہیں ناموں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

فارسی زبان و ادب کے فروغ میں خانقاہوں کا حصہ:

فارسی زبان اور ادب کی تاریخ میں خانقاہوں کا کردار نہایت اہم رہا ہے۔خانقاہیں صرف روحانی مراکز ہی نہیں تھیں بلکہ علمی و ادبی تحریکات کا بھی مرکز رہی ہیں۔ برصغیر، ایران اور دیگر اسلامی خطوں میں خانقاہی نظام نے فارسی زبان کو فروغ دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔صوفیا نے اپنی تعلیمات کو فارسی زبان میں عام کیا، جس کی وجہ سے فارسی ایک ادبی اور علمی زبان کے طور پر پروان چڑھی۔

خانقاہیں وہ روحانی مراکز ہوتی ہیں جہاں صوفیا کرام اپنے پیروکاروں کی تربیت کرتے تھے۔ان مراکز میں ذکر و اذکار، عبادات، اور روحانی اصلاح کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی سرگرمیاں بھی جاری رہتی تھیں۔ صوفیا کرام نے مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ فارسی زبان و ادب کو بھی پروان چڑھایا، کیونکہ فارسی اس وقت اسلامی دنیا میں علمی اور ادبی زبان تھی۔انہیں صوفیائے کرام کے ذریعے بعد میں جب اردو زبان و ادب کا چلن عام ہونا شروع ہوا تو انہوں نے اردو زبان و ادب کو بھی خوب فروغ دیا۔یہی سبب ہے کہ اردو زبان و ادب کی ابتدائی تمام تخلیقات خواہ وہ نثری ہو یا نظمیہ تمام میں صوفیانہ عناصر وافر مقدار میں موجود ہیں۔اسی سلسلے میں اردو کے تمام کلاسیکل شاعر ہیں تمام صوفی شعراء کی صف میں شامل ہیں اور ابتدائی نثری نسخوں کی بھی یہی صورتحال ہے۔

خانقاہوں میں فارسی شاعری کا رواج عام تھا۔صوفی شعرا نے اپنی تعلیمات کو عام فہم بنانے کے لیے فارسی میں شاعری کی، تاکہ عوام الناس آسانی سے ان کے پیغامات کو سمجھ سکیں۔

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ آپ کی کتاب ''کشف المحجوب'' فارسی زبان میں لکھی گئی، جو صوفیانہ تعلیمات کا پہلا مکمل فارسی متن سمجھا جاتا ہے۔اس کتاب نے فارسی نثر کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ انہوں نے اپنی تبلیغ میں فارسی زبان کا استعمال کیا۔ان کی درگاہ کے گرد و نواح میں فارسی کا فروغ ہوا اور ان کے پیروکاروں نے اس زبان میں بیش بہا تصانیف پیش کیں۔یوں تو ہندوستان میں عہدِ صحابۂ کرام سے ہی اسلام کے مبلغین کا آنا شروع ہو گیا تھا ان کے بعد محمد قاسم کے سندگھ پر حملہ سے باضابطہ اسلامی تعلیمات یہاں عام ہو چکی تھیں، لیکن خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے بھی ہندوستان میں اسلام کی ترویج و اشاعت میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے جس کو کسی بھی صورت میں انکار نہیں کیا جا سکتا۔



CamScanner



بابا فرید الدین گنج شکرؒ اگرچہ آپ کا زیادہ کلام پنجابی میں ہے، لیکن آپ کی خانقاہ میں فارسی ادب کا چرچا عام تھا۔

مولانا جلال الدین رومیؒ ان کی مشہور تصنیف ''مثنوی معنوی'' فارسی زبان میں ہے اور آج بھی دنیا بھر میں فارسی ادب کی شاہکار سمجھی جاتی ہے۔اور ہر مشہور دانشگاہ University کی اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں شامل ہے۔

خانقاہوں میں مدارس بھی قائم تھے۔ جہاں فارسی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ان مدارس میں قرآن و حدیث، فقہ، تصوف اور ادب کی تعلیم دی جاتی تھی، اور ان تمام علوم کی تدریس میں فارسی زبان کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔

نظامیہ مدارس:

یہ مدارس خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے زیرِ سرپرستی چلتے تھے، جہاں فارسی ادب کی ترویج ہوئی۔

مدرسہ بہاء الدین زکریا ملتان: حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ ایک عظیم تعلیمی مرکز تھی جہاں فارسی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔

خانقاہوں میں فارسی زبان میں نثر و نغمہ نگاری کو فروغ دیا گیا۔تصوف کے موضوعات پر فارسی میں نثری کتب اور ملفوظات مرتب کیے گئے۔

شیخ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات۔ان کے ملفوظات کو امیر خسرو نے فارسی میں قلمبند کیا، جو فارسی ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔

امیر خسروؒ موصوف وہ ایک عظیم شاعر، موسیقار اور نثر نگار تھے، جنہوں نے فارسی زبان میں بے شمار تخلیقات پیش کیں۔ان کا فارسی کلام آج بھی تصوف اور فارسی ادب کا سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔اردو کے پہلے شاعر ہونے کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے گرچہ انہوں نے ایک دوسرے بزرگ کو اردو کے پہلے غزل ہونے کی بات کہی ہے لیکن اب تک ان کی کوئی باضابطہ غزل سامنے نہیں آسکی ہے جس کو پورے وثوق سے ان کی تخلیق کہی جا سکے۔

فارسی زبان میں مراسلات و مکاتیب خانقاہوں کے بزرگوں نے اپنے مریدین کو فارسی میں خطوط لکھے، جو بعد میں فارسی ادب کا قیمتی اثاثہ بنے۔انہیں بزرگوں میں شیخ احمد سرہندیؒ کے خطوط ( مکتوبات ) فارسی میں لکھے گئے اور یہ تصوف و اصلاحی تعلیمات کے اہم ذرائع بنے۔

درباری سرپرستی اور خانقاہوں کا اثر

خانقاہوں کی بدولت فارسی زبان کو درباروں میں بھی اہمیت ملی۔مغل بادشاہوں، خاص طور پر

ISSN : 2582 - 3612

اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے ادوار میں فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ ملا، اور خانقاہوں کے بزرگان دین درباروں میں فارسی زبان کی ترویج میں مددگار ثابت ہوئے۔

خانقاہوں کی کاوشوں کے نتیجے میں:

۱۔ فارسی زبان برصغیر کی علمی وادبی زبان بن گئی۔
۲۔ صوفیانہ شاعری کا ایک عظیم ذخیرہ تخلیق ہوا۔
۳۔ فارسی نثر میں علمی ودینی کتب کی بڑی تعداد شامل ہوئی۔
۴۔ خانقاہوں کے ذریعے عوام میں فارسی زبان رائج ہوئی۔
۵۔ فارسی ہندوستان میں ملک گیر سطح پر سرکاری زبان کا درجہ حاصل کر لی۔
۶۔ فارسی زبان میں کئی سنسکرت کی مشہور کتب کے تراجم بھی کیے گیے۔

فارسی زبان کے فروغ میں خانقاہوں کا کردار نا قابلِ فراموش ہے۔ یہ خانقاہیں نہ صرف روحانی بلکہ علمی وادبی مراکز بھی تھیں، جہاں صوفیا کرام نے اپنے وعظ ونصیحت، شاعری اور تصانیف کے ذریعے فارسی زبان کو تقویت بخشی۔ ان کی کاوشوں کے نتیجے میں فارسی زبان برصغیر میں صدیوں تک علمی وادبی زبان کے طور پر قائم رہی۔

منبع وماخذ:


۱۔ خانقاہ عمادیہ ایک تعارف، حافظ محمد اظہر امام
۲۔ بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن
۳۔ سہ ماہی ''دیوان'' ص۔۲۳
۴۔ الشرف، محمد طیب ابدالی، مکتبہ صوفیا، ضلع نالندہ، بہار
۵۔ تذکرہ شعرائے منیر، شاہ مراد اللہ منیری، خانقاہ منیر بہار



**Syed Wasimullah Bokhari**
Research Scholar
Deptt. of Urdu & Persian
Veer Kunwar Singh University
Ara (Bihar)
Mob.- 94306 22387




CamScanner



نکہت انجم ناظم الدین

# ایک سلطانہ اور ادیبہ کی خودنوشت: گوہر اقبال

نواب سلطان جہاں بیگم برصغیر کی ان چند مسلم حکمران خواتین میں شامل ہیں جنھوں نے سیاسی، تعلیمی، عدالتی، سماجی اور ادبی میدان میں نمایاں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔اور زندگی کے کئی شعبۂ جات میں اصلاحات متعارف کروائی ہیں۔ان کی خودنوشت " گوہر اقبال" نہ صرف ان کی ذاتی زندگی کا عکس ہے بلکہ ان کے فکری، اصلاحی اور حکومتی نظریات کو بھی واضح کرتی ہے۔ یہ خودنوشت اس دور کے سماجی، سیاسی اور تعلیمی رجحانات کو سمجھنے کا اہم ذریعہ بھی ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم کی خودنوشت اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ نہ صرف ایک خاتون حکمران کی یادداشتیں ہیں بلکہ ایک فکری اور اصلاحی منشور بھی ہیں۔نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی خودنوشت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔انھوں نےحصہ اول کو ''گوہر اقبال'' نام دیا ہے اور حصہ دوم کو ''اختر اقبال۔حصہ دوم گوہر اقبال''۔اپنی خودنوشت میں انہوں نے ذاتی زندگی، ابتدائی تعلیم، والدہ نواب شاہجہاں بیگم کے زیر سایہ تربیت، اور حکمرانی کے ابتدائی دور کو بیان کیا ہے۔اسی طرح حکمرانی کے دور کے چیلنجز، اصلاحات، خواتین کی تعلیم کے لیے ان کی جدوجہد، اور برطانوی سامراج کے ساتھ ان کے تعلقات کا ذکر ملتا ہے۔ یہ دونوں خودنوشت ایک ایسی خاتون کی فکری اور عملی کاوشوں کو ظاہر کرتی ہیں جو روایتی سماج میں رہتے ہوئے جدیدیت اور ترقی کی داعی تھیں۔

انھوں نے دونوں حصوں میں جن موضوعات کو قلمبند کیا ہے وہ اس طرح سے ہیں: ذاتی زندگی اور جذباتی پہلو، اپنی والدہ نواب شاہجہاں بیگم سے محبت، رنجش اور ان کی شخصیت پر اثرات، تعلیم کے ابتدائی مراحل اور ذہنی ترقی، حکمرانی کے ابتدائی دور میں درپیش مشکلات اور ان پر قابو پانے کی کوششیں، برطانوی حکومت کے ساتھ تعلقات اور سفارتی حکمت عملی، ریاست میں عدالتی، تعلیمی اور سماجی اصلاحات کا نفاذ وغیرہ۔

انھوں نے برطانوی حکومت کے ساتھ اپنے تعلقات کو سفارت کاری کے ذریعے مضبوط بنایا لیکن اپنی ریاست کی خودمختاری پر کبھی سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئیں۔عدالتی نظام میں اصلاحات جن میں دیوانی اور فوجداری مقدمات کے بہتر فیصلے شامل تھے۔نواب سلطان جہاں بیگم کی نثر سادہ، شائستہ اور

ISSN : 2582 - 3612

با مقصد ہے۔ ان کی تحریروں میں فصاحت اور بلاغت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ایک مدبر حکمران بلکہ ایک کہنہ مشق ادیبہ بھی تھیں۔ گوہر اقبال اور اختر اقبال میں قرآن مجید، احادیث، اور اسلامی تاریخ کے حوالے بھی ملتے ہیں جو ان کی فکری گہرائی کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی تعلیمی اور سماجی اصلاحات نے نہ صرف بھوپال کو ایک ترقی یافتہ ریاست بنایا بلکہ دیگر مسلم حکمرانوں کو بھی متاثر کیا۔ آج بھی ان کے اصلاحی نظریات خواتین کی ترقی کے لیے مشعل راہ ہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی خودنوشتیں محض ذاتی یادداشتیں نہیں بلکہ ایک تاریخی، ادبی، اور سماجی ورثہ ہیں۔ ان کی شخصیت اور تحریروں کا مطالعہ ہمیں برصغیر کی مسلم خواتین کی تعلیم، سیاست، اور سماجی ترقی کے ایک اہم دور سے روشناس کراتا ہے۔

سلطان جہاں بیگم نے متعدد تاریخی اور سوانحی کتب لکھی ہیں۔ ان کی لکھی گئی تمام تصانیف کی اہمیت مسلم ہے لیکن گوہر اقبال اور اختر اقبال کو خودنوشت کی حیثیت حاصل ہے اس لیے کتابیں یہ بہت اہم ہیں۔ " گوہر اقبال" نواب سلطان جہاں بیگم کی تحریر کردہ خودنوشت کا حصہ اول ہے۔ یہ کتاب ۳۵۳ صفحات اور ۵۶ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے عہد حکومت کے سات برسوں کا احاطہ کیا ہے۔ گوہر اقبال مطبع سلطانی بھوپال کے زیر اہتمام ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء میں طبع ہوئی۔ مصنفہ نے کتاب کے دیباچے میں دوست محمد خاں تا نواب شاہجہاں بیگم کے عہد حکومت کو تحریر کر کے بھوپال کے حکمرانوں کے طرز حکومت اور نظم وضبط کی صلاحیتوں کی ستائش کی ہے۔

''مختصر واقعات'' کے عنوان سے ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء تا ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۱ء تک کے واقعات قلمبند کیے ہیں۔ جس میں تقریبات، وزارت، شاہی درباروں میں شرکت، مہمان ریاست اور مہمانوں کی تقاریر وغیرہ جیسے کئی ضمنی موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ ان واقعات میں ۱۸۸۲ء میں بھوپال میں ریلوے کا افتتاح ہونے کے بارے میں معلومات بھی فراہم کی گئی ہے۔ ''مختصر حالات زندگی'' کے عنوان سے انہوں نے نواب شاہجہاں بیگم کے بارے میں مختصراً لکھا ہے۔ معلوم رہے کہ انہوں نے اپنی والدہ نواب شاہجہاں بیگم کی سوانح عمری ''حیات شاہجہانی'' کے نام سے لکھی ہے جس میں ان کی شخصیت، عہد حکومت اور انتظامی صلاحیتوں سے متعلق مفصل معلومات فراہم کی گئی ہے۔ ''میری حکومت کے ابتدائی ۱۵ دن'' کے عنوان سے انہوں نے اپنی حکومت کے ابتدائی ۱۵ دنوں سے متعلق مفصل معلومات رقم کی ہے۔ ان کی والدہ کے انتقال کے فوراً بعد انہیں ریاست بھوپال کی رئیسہ تسلیم کیا گیا۔ برطانوی حکومت کے ذریعے تین دن بعد ان کی دربار صدر نشینی کی تقریب منعقد کی جانے والی تھی لیکن نواب سلطان جہاں بیگم نے منع کر دیا اور تاریخ آگے بڑھا دی۔ اپنی صدر نشینی کی تقریب میں انہوں نے انتہائی دلپزیر تقریر کی۔ جسے شرکائے دربار نے بے حد پسند کیا۔ '' گوہر اقبال'' میں بیان کیے گئے تمام حالات و واقعات اس قدر مناسب اور موزوں الفاظ


CamScanner



میں بیان کیے گئے ہیں کہ قاری اپنے آپ کو اسی عہد میں محسوس کرتا ہے۔ تقریبات، دربار و سانحات وغیرہ واقعات نگاہوں کے سامنے ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اپنے شوہر نواب احمد علی خاں کی موت کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ

> '' ان الفاظ نے بالکل امید منقطع کر دی اور وہ صدمہ پہنچایا جو بیان نہیں ہوسکتا۔ دراصل صدمے کا لفظ قلم سے لکھا جا سکتا ہے اور زبان سے بولا جا سکتا ہے لیکن اس کی حالت تلفظ سے ادا ہوسکتی ہے اور نہ کسی طرح تحریر میں آسکتی ہے۔ ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسے وقت میں جب کہ سچے مشیروں اور قابل ہمدردوں کی مجھے سخت ضرورت تھی ایک ایسے بیدار مغز خیر خواہ گرامی قدر مشیر کا جس نے ۲۷ سال ہر طرح کی رفاقت اور خیر خواہی میں میرے ساتھ بسر کیے اور جس سے زیادہ دنیا میں کوئی عمدہ اور قابل مشیر نہ تھا۔ خانگی معاملات اور ریاستی انتظامات میں جیسی اعلی اور صائب رائیں انہوں نے دیں اور جس دل سوزی کے ساتھ میری ہمدردی کی اس کا کامل اندازہ میرا دل ہی کر سکتا ہے بس اس کا یکایک انتقال کر جانا میرے لیے کیسا دل شکن اور غم انگیز حادثہ تھا۔''
>
> ( گوہر اقبال، نواب سلطان جہاں بیگم، ص۔ ۳۵ )

صبر اور آزمائش سے متعلق وہ لکھتی ہیں کہ :

> '' گر ہم غمناک حادثات کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہم کو بہت سے ایسے حادثے ملیں گے جو خدا کے نہایت نیک اور برگزیدہ بندوں پر گزرتے ہیں اور ان سے محض قضائے الٰہی پر صبر کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ دراصل خداوند کریم انسانوں کے صبر کی آزمائش صدمات و تکالیف سے کیا کرتا ہے اگر انسان اس آزمائش میں جو صبر کا حقیقی مفہوم ہے پورا اترتا ہے تو وہ کامیاب سمجھا جاتا ہے۔''
>
> ( گوہر اقبال، نواب سلطان جہاں بیگم، ص۔ ۳۶ )

مصنفہ نے مختلف ابواب میں اپنے دور حکومت میں کی گئی اصلاحات اور ترقیات کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب نواب سلطان جہاں بیگم کو ایک حکمراں ہی نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے طور پر متعارف کرواتی ہے۔ سال ہشتم یعنی ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۹ء سے سال دوازدہم صدر نشینی ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء تک کے حالات حصہ دوم یعنی '' اختر اقبال'' میں درج کیے گئے ہیں۔ یہ حصہ ۲۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ جو ۱۹۱۷ء میں

ISSN : 2582 - 3612

مطبع مفید عام آگرہ میں طبع ہوا۔ ''اختر اقبال'' میں ۳۳ عنوانات قائم کر کے مصنفہ نے تاریخ کو آگے بڑھایا ہے۔ جس میں عدالت و پولیس میں اصلاح، افواج ہند کے سپہ سالار اعظم کی تشریف آوری، ڈیلی کالج کے افتتاح میں شرکت، لاڑ ہارڈنگ کی بھوپال آمد، سال یاز دہم اور دواز دہم کے متفرق حالات اور انتظامات سے متعلق تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

**Nikhat Anjum Nazimuddin**
ResearchScholar
**Dr.Sajid Ali Qadri**
Supervisor
Department of Urdu
K. B.C.N. M. University
Jalgaon (Maharashtra)
Mob.- 77096 55458



CamScanner



شاذیہ خاتون

# شادؔ عظیم آبادی کی غزل گوئی

شادؔ عظیم آبادی دبستان عظیم آباد کی مضبوط پایۂ تکمیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے دبستان عظیم آباد کی آبرو ہی نہیں رکھی بلکہ یوں کہنا غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے پوری اردو شاعری چاہے وہ دبستان دہلی ہو، دبستان لکھنو کو عزت بخشی ہے۔ شادؔ نے اس وقت اردو شاعری کی باگ ڈور سنبھالی جب اردو شاعری فحش نگاری کے راستے پر گامزن ہو چکی تھی۔ رکیک اور عریاں شاعری کا چلن عام ہو چکا تھا۔ انہوں نے اس وقت عام روش سے ہٹ کر اردو شاعری کو عزت بخشی، اسے صاف اور شفاف فضا میں جینا سکھایا۔ اردو شاعری خصوصاً اردو غزل کو شہرت دوام کے بام پر بیٹھایا۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی :

> ''کلاسیکی غزل کے کئی رنگوں کو اختیار کر کے انہیں سچے اور خالص ادب میں پیش کرنا شادؔ کا کارنامہ ہے۔''

چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۔

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

میں کہاں، واعظ کہاں، توبہ کرو
جو نہ سمجھا خود وہ کیا سمجھائے گا

نگاہ ناز سے ساقی کا دیکھنا مجھ کو
مرا وہ ہاتھ میں ساغر اٹھا کے رہ جانا

شادؔ کی شاعری ایک حکیمانہ مزاج رکھتی ہے۔ طرز ادا اور اسلوب بہت سلجھا ہوا، سجا سجایا اور پروقار ہے۔ ان کے اشعار کی شیرینی، گھلاوٹ اور دلکشی لاجواب ہے۔ ان کے اشعار میں ایک خاص طرح کی گرمی، سوز اور کسک ہے۔ ان کی غزلوں میں مسرت آفرینی کے ساتھ بصیرت افروزی بھی نمایاں ہے۔ شادؔ کی

غزلوں میں روایت شکنی کے نہیں بلکہ روایت میں توسیع کے نشانات ملتے ہیں۔ انہیں شاعروں کے جم غفیر میں بھی انفرادیت عطا کرتی ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے شاد کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کیا ہے:

> ''شاد عظیم آبادی بلاشبہ ایک شعور منداور آگاہ شخصیت کے مالک تھے۔ جن کے لئے روایت ایک اہم سوال تھی کہ اسے قبول کیا جائے تو کس حد تک اور رد کیا جائے تو کس حد تک۔ انہیں یہ بھی بخوبی علم تھا کہ ہر عہد کا ایک عمومی بلکہ حاوی مذاق بھی ہوتا ہے۔ جو اکثر فنکاروں کو بڑے فریب میں مبتلا رکھتا ہے۔ جو فنکار عمومی مذاق کو فوری تحسین وستائش کے حصول کی غرض سے اخذ کرتے ہیں وقتی شہرتیں ان کے قدم چومتی ہیں۔ جیسے شاہ نصیر، ذوق اور داغ وغیرہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ بعض ایسے فنکار بھی ہوتے ہیں جو عصری عمومی مذاق کی اضافیت اور عارضیت کے راز سے واقف ہوتے ہیں۔ وہ اس سے متصادم بھی ہوتے ہیں۔ ان کے فن کو پہچاننے اور سہی معنوں میں ان کی شایان شان قدر ومنزلت کرنے والی نسل بعد کے زمانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ شاد بھی ان نسلوں پر زیادہ قانع تھے جو پردۂ غیاب میں تھیں۔ ان کا شمار بھی انہیں فنکاروں میں کیا جانا چاہئے۔ جنہیں صرف اور صرف اپنی تلاش سے غرض تھی۔''
>
> (شاد کی غزل کے دو رنگ، پروفیسر عتیق اللہ، اردو دنیا، جنوری ۲۰۱۳ء، ص۔ ۴۰)

شاد کے یہاں عشق اپنے نئے اور پروقار انداز میں جلوہ افروز ہے۔ انہوں نے اپنی غزل میں انسانی جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے جو موصوف کا ہی انفرادی وصف ہے۔ دوسرے شاعروں کی طرح شاد کا عشق پاکیزگی اور عظمت کی ردا سے کچھ اس طرح لپٹا ہوا ہے کہ قاری کا ذن باغ باغ ہو جاتا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے انہیں وجوہات کی بنا پر انہیں اپنے زمانے کا میر قرار دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو ۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
جو یاد نہ آئے بھول کے پھر اسے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

اب انتہا کا ترے ذکر میں اثر آیا
کہ منہ سے نام لیا دل میں تو اتر آیا



CamScanner



جب کسی نے حال پوچھا رو دیا
چشم تر تو نے تو مجھ کو کھو دیا

اے عشق کیا قصور تھا مجھ بے قصور کا
انسانیت نے داغ لگایا شعور کا

خیال وصل کو اب آرزو جھولے جھلاتی ہے
قریب آنا دل مایوس کا پھر دور ہو جانا

شاؔد کے کلام میں میرؔ، دردؔ، آتشؔ، انیسؔ، غالبؔ، داغؔ، خسرؔو اور عرفیؔ کی بھی جھلکیاں ملتی ہیں، ان شاعروں کی جھلکیوں کے باوجود غزل میں طرز اسلوب کو ہمیشہ ہی پاک رکھنے کی کوششیں کی۔ انہوں نے دور از کار تشبیہات واستعارات، مبالغہ آمیز، مفروضیات، [۴] محاورات اور ضرب المثل کی بہتات سے اجتناب کیا ہے۔ انہوں نے رند، ساقی، پیر مغاں، مینا، شراب خم، قلقل، جام وغیرہ کے موضوع کو بھی اپنایا ہے۔ اس موضوع کو برتنے میں ریاضؔ اور داغؔ کا بھی نام آتا ہے، لیکن وہ اس میں اتنے کامیاب نہیں ہوئے جتنے کے شاؔد اس مشاہدے میں کامیاب ہوئے۔ مثلاً ۔

مزا ہے بادہ کشی کا وہیں تو اے ساقی
پیوں جو اب تو ترے آستاں پہ رکے پیوں

لے کے خود پیر مغاں ہاتھ میں مینا آیا
مئے کشو شرم کہ اس پر بھی نہ پینا آیا

کبھی کبھی رندوں کو بھی جرأت مندی دکھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا بھی انداز دیکھئے ۔

یہ بزم مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

شاؔد کی غزلوں میں تخلیقی محر کے پایا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں بے ثباتی زندگی، اسرار کائنات، حسن کی تجلیاں اور عشق کی وارفتگیاں موجود ہیں۔ مثال دیکھے ۔

نہ مٹے گی دل سے یہ آرزو کہ لگا کے آنکھوں سے چوم لوں
ترے پاؤں تک نہیں دسترس ترے آستاں کی زمیں سہی

ISSN : 2582 - 3612

غزل ادب کی سب سے محبوب صنف سخن ہے، اس میں عام لوگوں کی دھڑکنیں دھڑکتی ہیں، اس میں ساز و آہنگ دونوں کے جلوے نظر آتے ہیں، شادؔ عظیم آبادی بھی ہر قسم کے خیالات و جذبات کی تصویر کشی کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ لفظوں کے تانے بانے سے اپنی غزلوں میں نت نئے معنی و مفہوم پیدا کرتے ہیں۔ شادؔ کی شاعری میں تصوف، اخلاق و سماج حسن و عشق سے متعلق جزئیات کی عکاسی ملتی ہے، مگر مضمون کے بیان میں توازن اور اعتدال، سنجیدگی اور ٹھہراؤ موجود ہے۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

نہ پوچھو شاد ویرانی کو دل کی کیا بتاؤں میں
تمنا جا چکی حسرت غریب اس میں اکیلی ہے

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

شادؔ کی غزلیں فکر و معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ فنی خوبیوں سے بھی مالا مال ہیں۔ زبان کی صفائی وسادگی ان کے اشعار کی نمایاں خوبی ہے۔ شادؔ شعر کو واردات قلبی کا آئینہ سمجھتے ہیں۔ جذبات کی صداقت ان کے نزدیک بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے کلام میں سوز و گداز ہے۔ نمونہ پیش ہے۔

کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوب اے ساقی!
خم آئے گا، صراحی آئے گی، تب جام آئے گا

شاد نے اپنی شاعری کے ذریعہ اردو شاعری میں ایک انفرادی مقام حاصل کیا ہے۔ ان کے یہاں متنوع موضوع پایا جاتا ہے۔ فکر و فلسفہ اور عرفانیات و تصوف کے علاوہ پند و نصیحت، درس اخلاق، درس عبرت جیسے موضوعات سے ان کا شعری سرمایہ بھرا پڑا ہے۔ بظاہر یہ خشک موضوعات ہیں۔ لیکن شاد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی جولانی شعری انداز سے اپنے موضوعات کو بھی قابل قبول بنا دیا ہے، جس سے پڑھتے وقت قاری گراں محسوس نہیں کرتا بلکہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس رنگ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

نہ ہم کام آئے غیروں کے نہ کوئی اپنے کام آیا
تعجب ہے کہ تو بھی زمرہ انساں میں نام آیا

جہاں تک ہو بسر کر زندگی عالی خیالوں میں
بنا دیتا ہے کامل بیٹھنا صاحب خیالوں میں





کدورت سے دل اپنا صاف رکھ اے شاد پیری میں
کہ جس کو منہ دکھانا ہے یہ آئینہ اسی کا ہے

سمجھ سمجھ کے بڑھا دست آرزو اے دوست
نہ میکدہ ، نہ صبوحی ، نہ خم ، نہ جام ترا

شادؔ عظیم آبادی نے ساری عمر شعر و ادب کی خدمت میں گزار دی۔ انہوں نے اردو غزل میں سچے جذبات و احساسات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اک نئے رنگ و آہنگ کو بخوبی پیش کیا ہے۔ غرض کہ شادؔ عظیم آبادی اردو شاعری خصوصاً اردو غزل کے افق پر ایک درخشندہ تارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آخر میں شادؔ کا ایک لافانی شعر ملاحظہ فرمائیں، جن میں انہوں نے اس سفر کی طرف اشارہ کیا ہے جیسے اس سرزمین سے ہر ذی روح کو طے کرنا ہے، جب کہ اس سفر کا نہ راستہ معلوم ہے اور نہ منزل کی نشاندہی ہے پر کرنا ضرور ہے۔

سفر ضرور ہے اور عذر کی مجال نہیں
مزہ تو یہ ہے نہ منزل نہ راستہ معلوم

**Shazia Khatoon**
Research Scholar
Deptt of Urdu
Patna University
Patna (Bihar)
Mob.- 62992 19505



CamScanner

شمع روبی

# رام لعل کی ناول نگاری کا تنقیدی تجزیہ

اردو ادب کی تمام اصناف میں ناول انتہائی زندہ صنف ادب ہے جس میں زندگی کی جیتی جاگتی، چلتی پھرتی، ہنستی روتی، نئے چولے بدلتی تصویریں پیش کی جاتی ہیے۔ زندگی کی حرکی و نامیاتی قدروں کی ترجمان ہونے کی بنا پر عصری تناظر کے اعتبار سے ناول کا دائرہ عمل تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ناول کا فن تخلیق کار کے ذہنی رویہ اور موضوع کے برتنے کا دوسرا نام ہے۔ وہ احساسات کی شدت اور جذبات کے پرخلوص اظہار کو الفاظ کے پیکر میں ڈھالتا ہے اور اپنے سماجی شعور، ثقافتی مزاج اور جمالیاتی نقطہ نظر سے مزین کرتا ہے۔ ترتیب و تزئین کے عمل میں فنی عوامل وسعت و بالیدگی حاصل کرتے ہیں اس لیے دیگر ادب پاروں کی روح ناول کو فنی ضرورتوں سے بے نیاز نہیں قرار دینا چاہیے۔ ناول کے لوازم کو مد نظر رکھتے ہوئے فنی عوامل کی محرکات پر نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں :

> ''ارسطو کے نزدیک ہیئت صرف ظاہری شکل و شباہت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ
> متشکل کرنے کا رویہ ہے جو نہ صرف خاکہ شکل اور سیرت کو متشکل کرتا ہے بلکہ
> ان اصولوں کو ترتیب دیتا ہے جو سیرت سازی کرتے ہیں۔''
>
> (ناول کا فن، ابوالکلام قاسمی۔ پیش لفظ، ص۔ ۱۰)

اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ صرف ظاہری شکل و شباہت کو ہیئت یا فن نہیں کہا جاسکتا بلکہ وہ ادبی رویہ اور عمل ہے جو کسی ادب پارہ کے موضوع و مواد کو صحیح مقصد عطا کر کے داخلی، ظاہری اور جسمانی حسن بخشتا ہے جسے حسن الفاظ، زبان اور انداز تحریر کے نام دیئے جاسکتے ہیں۔ اصناف ادب کے تمام پارہ اپنی جداگانہ ٹیکنک رکھتے ہیں اس لیے ناول کی بھی علاحدہ ٹیکنک کا ہونا لازمی اور ناگزیر ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی:

> ''ناول کچھ فنی اصول پر مبنی ہوتا ہے۔ ہر باسلیقہ ناول نگار قصہ کے بیان کرنے
> میں یا کردار کے ظاہر کرنے میں کسی خاص ٹیکنک سے کام لیتا ہے۔''
>
> (ناول کا جدید فن۔ از سید محمد عقیل، ص۔ ۵۴)

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی زبان اور مغربی ادب نے اردو ادب کو کافی متاثر کیا۔ مولانا محمد حسین



CS CamScanner



آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کے زیر اثر شاعری میں زبردست انقلاب آیا۔ سر سید اور ان کے رفقا نے اردو نثر کی مختلف اصناف میں ہیئت کے نئے نئے تجربے کیے۔ سر سید نے نئے نئے موضوعات پر مضامین لکھے۔ ان کے ایک ساتھی ڈپٹی نذیر احمد نے اردو میں ناول نگاری کا ڈول ڈالا۔ 'مراۃ العروس' اردو کا اور ڈپٹی صاحب کا پہلا ناول ہے۔ اس کے بعد 'بنات النعش'، 'توبتہ النصوح'، 'بنات الناس'، 'ابن الوقت' ناول شائع ہوئے۔ ان ناولوں میں اس زمانے کی معاشرے کی اچھی اور سچی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ ان کا ماحول اور کردار ہماری دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ناولوں کی سب سے مستحکم خصوصیت ان کی مکالمہ نگاری ہے۔

نذیر احمد کے بعد پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ناول 'فسانہ آزاد' بہت زیادہ مقبول ہوا۔ اس ناول میں زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بیگمات کی زندگی، نوابوں کی صحبتیں، سرائے کی بھٹیارنوں کی حالتیں، بازار کی رونقیں، متوسط طبقے کے حالات وغیرہ کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس ناول کا سب سے بڑا کمال خوجی کا کردار ہے۔ ان کے دیگر ناول 'سیر کہسار'، جامِ سرشار اور کامنی ہیں۔

ملک کی آزادی کے ساتھ تقسیم کے المیہ کی وجہ سے فسادات کی جو لہر چلی اس کے خلاف رامانند ساگر نے 'اور انسان مر گیا' اور کرشن چندر نے 'ہم وحشی ہیں' اور 'غدار' لکھ کر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔ عبداللہ حسین نے اپنے ناول 'اداس نسلیں' میں پہلی جنگ عظیم کے واقعات بیان کیے ہیں۔ اس ناول میں ۱۹۱۴ء سے تقسیم کے بعد تک کے مختلف واقعات کو ہندوستان کے حقیقی پس منظر میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی اداس نسل کی کہانی خدیجہ مستور کے ناول 'آنگن' میں ملتی ہے۔ اس میں ایک متوسط مسلم گھرانے کی زندگی کو پیش کرتے ہوئے جدو جہد آزادی، ملک اور بیرونی ملک کے سارے واقعات کو صرف آنگن کی چار دیواری میں بڑے سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول کہانی کے فطری بہاؤ، واقعات کی فطری ترتیب اور پختہ کردار کی بدولت پریم چند، شوکت صدیقی اور عزیز احمد کے فن سے آگے کی تخلیق ہے۔

فسادات اور ہجرت کے بعد زمینداری اور تعلقہ داری نظام کے خاتمہ نے ہندوستانی سماج کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ قاضی عبدالستار نے 'شب گزیدہ' اور انور عظیم نے 'دھواں دھواں سویرا' میں مذکورہ موضوع کو بیان کیا ہے۔ رام لعل نے بھی ناول لکھے ہیں جیسے مٹھی بھر دھوپ ۱۹۷۱، کہرا اور مسکراہٹ، نیل دھارا'' ۱۹۸۱ء وغیرہ۔ قرۃ العین حیدر کے ناول 'میرے بھی صنم خانے' میں بھی اسی نظام کے ٹوٹنے بکھرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جیلانی بانو کا ناول 'ایوانِ غزل' بھی جاگیردارانہ ماحول کی عمدہ تصویر پیش کرتا ہے۔

جہاں تک اردو میں ناول نگاری کو دیکھا جائے تو بہت سارے ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں قدیم روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس صنف کو پروانے چڑھانے میں حتی الامکان کوشش کی ہے۔ اسی طرح سے رام لعل نے بھی اس صنف میں اپنے شاہکار چھوڑے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنی ناول میں قدیم

روایت کو نہ اپنا کر بلکہ ایک نئے طرز ادا کو اظہار کا موجوض بنا کر ناول لکھے ہیں ۔ان کی ناول نگاری اس عہد کی بھر پور عکاسی کرتی ہیں ۔جیسے کہ ان کا ناول ہے مٹھی بھر دھوپ'' یہ ناول لکھنو کے معاشرے پر مبنی ہے ۔لکھنوی تہذیب وتمدن کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا ۔زمانہ ماضی میں اس شہر کی چرچا پوری دنیا میں صرف اس کی معاشرتی اور ثقافتی بنیاد پر تھی ۔اس لئے اس زمانے کے لکھنے والے لوگوں نے بھی اپنی تخلیقات میں یہاں کے کلچر اور ثقافت کو پیش کیا ہے ۔''نیل دھارا'' ناول کلکتہ شہر کی عکاسی کی گئی ہے ۔کلکتہ کسی زمانے میں تعلیم کا مرکز رہا ہے ۔انگریزوں کے زمانے عالمی تجارت کا مرکز تھا۔تہذیب وثقافت کے اعتبار سے یہ ملک کی راجدھانی بھی رہا ہے۔

رام لعل نے اپنی ناولوں میں پلاٹ نگاری کی عمدہ مثال پیش کی ہے ۔ناول کا پلاٹ داستان کے مقابلے میں بہت سادہ ہوتا ہے ۔ان کے ناول پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں جس وقت ناول لکھنا شروع کیا تھا اس سے قبل اپنے معاصرین کی تمام تر ناولوں کا مطالعہ کر لیا تھا ۔اس کے بعد پھر اپنے قلم کو اس میدان میں دوڑانا شروع کر دیا ۔جس کے نتیجے میں یکے بعد دیگرے ان کے ناول منظر عام پر آتے چلے گئے ۔کچھ دنوں کے بعد انہوں نے افسانہ نگاری میں بھی قدم جمایا ۔اور دیکھتے دیکھتے افسانوی مجموعے کی لمبی تعداد کھڑی کر دی۔

رام لعل نے اپنی ناولوں میں سماجی ۔تہذیبی ،تعلیمی ،معاشی ،اور ثقافتی عناصر کو بیان کیا ہے ۔ انہوں اپنی تمام تر ناولوں میں ان تمام عناصر کو بڑی ہنر مندی کے ساتھ بیان کیا ہے ۔اگر ہم منظر کشی کی بات کریں تو ان کا ناول ''نیل دھارا'' کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رام لعل نے اس ناول میں جس طرح سے منظر کشی کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے رام لعل جب کسی منظر نامے کو پیش کرتے ہیں تو سب سے پہلے زمان و مکان کو خوب غور سے دیکھتے ہیں اور فکر کرنے کے بعد اپنے قلم کو حرکت دیتے ہیں مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیں :

> ''کیا گڈ مڈ ہو گیا ہے سب است زندگی کے بارے ایسا تو نہیں تھا۔ یہ کہہ کر میں اُٹھ گئی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی اور بولی ۔میری ننھی گڑیا!
> بے حد سادہ اور افسوس ناک ! میں تو سمجھتی تھی یہ میری کہانی تھی ۔لیکن ان کی میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کہانی کی ایک گہرائی یہ سچا ہو سکتی تھی ۔
> یہ میری اہم سے بالاتر تھے پر میں کامیاب نہ ہو سکی۔ تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو میرے من میں فوراً یہ خیال اُٹھا تھا۔ میں تمہارے مرجھائے ہوئے چہرہ کو دیکھا ۔۔''خوشی سے اس نے کہا'' ۔۔۔''تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔



CamScanner



> ''میں تمہیں کبھی اداس نہیں دیکھنا چاہتی تھی ۔
> ''ذہن جیسے خالی سا ہو گیا تھا میرا جی چاہا رو پڑوں ۔میں اس کے پاس بیٹھ گئی اور اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا میرے کان گونج رہے تھے ۔
> ''میں دُکھی ضرور تھی ۔ پر انھوں نے ہی مجھے منع کر دیا تھا۔ میرا جی چاہا تھا اس کے جسم کے ساتھ لگ کر بالکل پگھل جاتی ۔اور اسے یہ بھی بتا دیتی کہ کاش وہ میری ماں ہوتی یا کیونکہ میں بے حد اداس رہتی تھی ۔لیکن میں ایسا نہ کر سکی ۔اس نے کہا۔ سومن دس روز کے بعد لوٹ رہا ہے ۔
> ''کیا یہ سن کر میں نے پھر بھی ایک صدمہ محسوس کیا ہے؟ لیکن نویدتا کو سومن واپس ملنا چاہئیے ۔اور اس کی آدھی خوشی بھی ۔ مجھے اپنے آپ کو قربان کرنا ہی پڑے گا۔ اپنی مرضی سے یہ سوچ کر میں مسکرا دی ۔اپنی غیر اہم شخصیت کو چھپا لینے کی یہ میری آخری کوشش تھی ۔میرے پاس قربان کرنے کے لیے تھا ہی کیا؟ کوئی امید بھی تو نہیں ! مجھے تو صرف خاتمہ بالخیر ہی کر دینا ہو گا یا پھر یہ کام مستقبل خود ہی کرے گا۔ میرا یہ تیاگ بھی مایوسی سے خالی نہیں تھا۔
> دیدی، جب یہ سب ختم ہو جائے گا تو میں آپ سے پھر آ کر ملوں گی ۔
> اُن سے بھی ۔اس وقت تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا سوائے انتظار کے ! دروازے پر پہنچ کر اس نے مجھے سینے سے لپٹا لیا اور کہا ۔ پھر جلدی آناء''
> ''اپنے کمرے میں پہنچ کر میں بستر پر گر پڑی ۔میں نے اسے کیا کیا کہہ دیا تھا۔ وہ مجھے اپنے بازؤوں میں لے کر پیار کرے گا۔''
>
> (ناول نیل دھارا ،از رام لعل ،ص ۔۱۰۱)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس طرح سے رام لعل نے ہر چھوٹی چھوٹی چیز کو بڑی باریک بینی سے سلسلہ وار بیان کرتے چلے جاتے ہیں ،اور ہر کردار اپنے آپ سارے باتیں بولتا ہے ،جس سے ناول میں تسلسل برقرار ہے اور ناول میں کہیں پر بھی قاری کو اکتاہٹ محسوس نہیں ہو رہی ہے ۔

جہاں تک پلاٹ نگاری کی بات ہے تو رام لعل نے اپن ی نالوں میں گتھا ہوا پلاٹ پیش کیا ہے ۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ناول کے اندر داستان کی طرح پلاٹ بھی پیش کیا جا سکتا ہے ۔ان کا ناول نیل دھارا کا یہ اقتباس ملاحظ کریں:

> ''وہ پھر ظہر کر بولنے کا عادی تھا۔ اس کے بازو بہت لمبے تھے ۔ایسا لگتا تھا وہ

مردوں کی اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے جو میرے جیسی جوان لڑکیوں کو آناً فاناً اغوا کرلے جاتے ہیں۔لیکن میں نے طے کرلیا اس سے خبردار ہی رہوں گی۔اگر چہ میں اس بات کے بارے میں بھی سوچنے سے باز نہ رہ پائی کہ اس نے مجھے کھانے پر مدعو کرتے وقت یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اس وقت اس کی بیوی بھی موجود رہے گی۔

اتنی جلدی مجھے اس کے ساتھ فوراً دوستی کر لینی چاہیئے۔ہم کتنے پیار سے تو کہنا شروع کردیا ہے۔

''سومن سنہا کے یہاں جا کر کھانا کھانے سے پہلے میرے دونوں دن بڑی بے قراری میں کٹے۔سمجھ میں نہیں آتا تھا اپنے ساتھ کیا سلوک کروں۔میں نے بڑی بے ولی سے ایگزام کی تیاری کی جو بہت دور نہیں تھا۔دو فلمیں بھی دیکھ آئی تھی۔مدھو سے پیار بھی پایا تھا۔اگر چہ اسے میں بھی چاہتی تھی لیکن پہلے میں اُسے کچھ بھی نہیں دیتی تھی۔میں سمجھتی تھی باہمی اعتماد،محبت اوراحترام کا جہاں تک تعلق ہے اس میں کسی قسم کے تبادلے کا جذبہ نہیں ہونا چاہیے۔میں جذبات کے بارے میں غور کرتے رہنے کی عادی تھی۔آخر ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن میں جذباتیت بالکل نہیں ہوتی۔انسان کو اتنا ہی کچھ قبول کر لینا چاہیے۔جو کچھ زندگی ہمیں دے سکتی ہے اوراس حقیقت کو میں خود اپنے لیے بے حد تکلیف دہ محسوس کر رہی تھی۔''

(ناول نیل دھارا،از رام لعل،ص۔۱۵۱)

ناول کسی بھی سماج کی تہذیب کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔یہ بات مسلم ہے کہ کوئی بھی ناول نگار جب ناول لکھنے بیٹھتا ہے تو اس وقت کے حالات و واقعات کو کی نمائندگی کرتے ہوئے تمام حالات کو بیان کرتا ہے۔یہاں پر اپنے ناول ''نیل دھارا میں انہوں نے سماج تعلیمی کی معیاری حیثیت کو اجاگر کرتے ہوئے اس وقت کے حالات کو کس حسن اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے دیکھا جا سکتا ہے۔اقتباس:

''میں ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں رہتی تھی جس کے قاعدے قوانین بہت سخت نہیں تھے۔رات کو میں گیارہ بجے تک ہی باہر رہ سکتی تھی۔میرے کمرے کی چھت بہت اونچی تھی۔کھڑکیاں چوڑی اور جالی دار تھیں جن میں سے روشنی اور تازہ ہوا بکثرت آسکتی تھی۔لیکن میں نے اپنے کمرے کو بالکل نہیں سجایا



CamScanner



تھا۔جب کہ دوسری لڑکیوں نے ایسا کر رکھا تھا۔ان میں سے اکثر کے کمروں میں اتم کمار سومترا چیپر جی ستیہ جیت رے،اپیتا بھ،مادھوی مکرجی اور دلیپ کمار وغیرہ کے فوٹو لگے ہوئے تھے۔جو علمی رسالوں سے کاٹ کاٹ کر چکائے گئے تھے۔انھیں وارڈن کی تیز نظروں سے بچانے کے لیے وہ ان کے اوپر اپنے کپڑے لڑکا دیتی تھیں۔بعض لڑکیوں کے گھروں میں نہرو،لیکن اور درگا ماں کے فوٹو بھی آویزاں تھے۔لیکن ہمارا ماحول زیادہ تر قدامت پرست قسم کا تھا جو مجھے پسند تھا۔میری کھڑکی ایک ایسے تکونے آنگن کی طرف کھلتی تھی جس کے باہر چار دیواری کھنچی ہوئی تھی۔اس کے پیچھے کلکتہ شہر کی ایک جھلک دکھائی دیتی تھی۔بے شمار گلیوں اور سڑکوں کے اوپر سے دکھائی دینے والی اونچی عمارتیں،ملوں کی چینیاں اور ٹی وی کے ان انٹینا لگے ہوئے ہیں۔''

(ناول ''نیل دھارا'' از رام لعل،ص۔۱۳۷)

اس اقتباس میں ناول نگار نے علاقائی اعتبار سے تعلیم کے اہمیت و افادیت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے،کلکتہ شہر جو کہ انگریزوں کے زمانے سے تعلیم کا اہم مرکز رہا ہے۔وہاں پر تعلیم کا جو معیار زمانہ ماضی میں تھا اس کے پورا ہندوستان واقف ہے۔بعد کے زمانے میں حالات کے تھپیڑے نے اس شہر کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا۔

کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کسی بھی ناول کی جان ہوا کرتی ہیں۔قاری کی دلچسپی کا سب سا ہم عنصر ناول کے اندر کردار اور مکالمے ہوا کرتے ہیں۔بعض کردار سست اور کاہل ہوا کرتے ہیں تو بعض بہت متحرک ہوتے ہیں۔جو کردار متحرک ہوتا ہے پورا ناول اس کے ادر گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔مرکزی کردار کے مقابلے میں کچھ کردار ایسے بھی ہوتے ہیں جو ناول کا جان ہوتے ہیں۔اقتباس :

''میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں آرتی۔مدھو کو کچھ باقی تو شاید بہت اچھا ہوتا۔تمہارا کیا خیال ہے؟

''اس کی صاف گوئی مجھے اپنی لگی۔میں نے جواب دیا یہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑا ہے لیکن یہ زیادہ اچھا ہوتا اگر میں ہی اسے سب کچھ بتا دیتی۔پھر بھی جتنا کی کوئی بات نہیں ہے۔

''اچھا یہ بات ہے۔اس نے جیسے اطمینان کا سانس لے لیا ہو۔وہ پھر بستر پر بیٹھ گئی اور بہت خوش دکھائی دینے لگی۔

ISSN : 2582 - 3612

''تو اب بتاؤ مجھے۔سارا کچھ!

''میں کوئی جواب دینے کے بجائے زور زور سے ہلنے لگی تم بھی ایک حد ہو سہانا پہلے تو تم نے دھو کو ناراض کر دیا۔ جب دیکھا وہ مجھ سے دور ہو چکا ہے تو تم مجھ سے کچھ زیادہ دلچسپ باتیں سننے کے لیے بے چین ہوا بھی ہو۔

''وہ بولی یہ میرا انداق مت اڑاؤ کرتی۔ مجھے سب کچھ بتاؤ نا! وہ ایک ننھی بچی کی طرح مچل گئی۔ ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں جو تمہیں بتا سکوں یہ میں نے مختصراً کہا۔ میں کسی کے ساتھ دو ہفتوں کے لیے ہر دوار چلی گئی تھی۔ اور ساری کہانی یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔اس نے شرما کر پوچھا۔کیا وہ شادی شدہ ہے؟

''نہیں بلکہ گونگا اور بہرہ ہے۔اچھا اب میں ذرا سوٹ کیس کھولوں۔ ساری چیزیں یونہی پڑی ہیں یہ تو میں ابھی انتظار کروں؟ جب مناسب وقت آئے گا تم اپنے آپ ہی بتا دوگی۔ میں نے الماری کھولتے ہوئے سوچا۔کسی روز میں جب بہت زیادہ پریشان ہوؤں گی تو اسے۔اپنی ساری بات بتاؤں میں؟۔۔۔''سہانا جیسے کوئی بہت بڑا انکشاف کرنے والی تھی۔۔۔۔''مجھے بھی ایک آدمی اچھا لگنے لگا ہے۔۔۔۔''اچھا لگنے لگا ہے۔اس کا مطلب یہ میں نے کچھ دلچسپی سے پوچھا؟

''پتہ نہیں کیوں، اسی کے بارے میں ہر وقت سوچتے ہوئے، اسی کے ساتھ گھومنے کی خواہش کرتے ہوئے جی چاہتا ہے۔شاید اسی کو محبت کہتے ہیں!''

(ناول نیل دھارا، از رام لعل۔ص ۸۳ سیمانت پرکاشن نئی دہلی۔۱۹۸۱ء)

اس قتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رام لعل نے اس ناول میں کردار نگاری کی جو مثال قائم کی ہے وہ بہ کم دیکھنے کو ملتی ہے۔مجموعی طور اگر کہا جائے تو رام لعل کا یہ ناول بہت کامیاب اور شاہکار ناول ہے ۔اردو ادب میں یہ ناول سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

**Shama Ruby**
Research Scholar
Department of Urdu
University of Mumbai
Mumbai (Maharashtra)
Mob.- 93898 11964



CamScanner



عیسیٰ اسلم

# ظفر امام کی نظم نگاری: ایک جائزہ

ظفر امام اردو ادب میں ایک نمایاں اور منفرد مقام کے حامل شاعر ہیں جنہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے اردو نظم کو ایک نئی صورت اور سمت عطا کی ہے۔ان کی شاعری کا اسلوب اپنے پیشرو شاعروں سے نمایاں طور پر مختلف ہے۔جہاں روایتی شعرانے کلاسیکی تراکیب اور اسالیب کو اختیار کیا تھا، وہیں ظفر امام نے اردو ادب میں جدیدیت کا ایک نیا رنگ دیا اور اپنی نظموں میں زبان و بیان کی باریکی اور گہرائی کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا۔ان کی نظموں میں ایک خاص نوعیت کی گہرائی اور اثر انگیزی نظر آتی ہے، جو انہیں دیگر شاعروں سے منفرد بناتی ہے۔

ظفر امام نے اپنی نظموں میں نہ صرف عصری مسائل کو اجاگر کیا ہے بلکہ ان میں گہرائی اور معنی کی ایک ایسی دنیا آباد کردی ہے جو کسی بھی بڑے شاعر کی خصوصیت ہوتی ہے۔ان کی نظمیں تعداد میں کم ہیں، لیکن ان کی فنی بلندی اور سماجی موضوعات پر گہری نظر انہیں جدید نظموں میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔ظفر امام نے نہ صرف روایتی خیالات کا اظہار ہے، بلکہ انہوں نے اپنے اشعار میں انفرادیت اور جدت کا بھی بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ان کی نظموں کا مرکزی موضوع ہمیشہ سماجی مسائل، انسانی جذبات اور روحانی تجربات رہا ہے۔

ظفر امام کی نظمیں ایک خاص سماجی اور ثقافتی تناظر میں لکھی گئی ہیں۔ان کی نظموں میں معاشرتی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے، خاص طور پر وہ مسائل جو انسان کے روزمرہ کے تجربات سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کی نظموں میں غربت، بھوک، محرومی، اور انسانوں کے درمیان تفاوت جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان کی شاعری میں یہ سماجی مسائل محض سطحی طور پر پیش نہیں کیے گئے بلکہ ان میں گہرائی اور پیچیدگی ہے جس کی وجہ سے ان کی نظموں کی اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ان کی نظموں میں جہاں ایک طرف زندگی کے تلخ اور کٹھن پہلو ہیں، وہیں دوسری طرف انسان کی جدوجہد اور اس کی امید کی شعاعیں بھی نظر آتی ہیں۔ یہ انسانیت کے درد اور ان کے عزم کی ایک گہری تصویر پیش کرتی ہیں۔ ہر نظم میں ایک نیا رنگ، ایک نیا زاویہ اور ایک نیا پیغام ملتا ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔انہوں نے اپنی نظموں میں نہ صرف جذبات کی شدت کو اجاگر کیا ہے بلکہ ان میں فکری سطح پر بھی ایک نیا پن ہے۔

ISSN : 2582 - 3612

ظفر امام کی نظمیں جدید اردو نظم کی فنی اور موضوعاتی ترقی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کی شاعری نے نہ صرف اس وقت کے سماجی اور ثقافتی مسائل کو اجاگر کیا ہے، بلکہ انسان کی اندرونی کیفیات اور احساسات کی گہرائی کو بھی بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ظفر امام نے جو نیا شعور اور فکر اپنی نظموں میں شامل کیا ہے، وہ اردو ادب میں ایک نیا رنگ لے کر آیا اور ان کی شاعری کو منفرد اور جدید شاعری کی ایک اہم بنیاد فراہم کی۔

ظفر امام کی نظموں میں موجودہ دور کے انسان کے مسائل کو ایک نیا زاویہ دیا گیا ہے۔انہوں نے ان مسائل کو اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ نہ صرف قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں بلکہ انسان کی زندگی کی پیچیدگیوں اور چیلنجز کو ایک نئی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ان کی نظموں میں جو حساسیت اور باریک بینی ہے، وہ موجودہ دور کی پیچیدہ حقیقتوں کو سمجھے بغیر ممکن نہیں تھی۔اس حساسیت نے ان کی نظموں کو ایک خاص گہرائی اور حقیقت پسندی دی ہے، جو انہیں معاصر شاعری سے ممتاز کرتی ہے۔

ظفر امام کی شاعری میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے، چاہے وہ معاشرتی مسائل ہوں یا فرد کی داخلی کشمکش۔ان کی شاعری میں سادگی اور پیچیدگی کا حسین امتزاج ہے، جو نہ صرف کلام کو گہرائی بخشتا ہے بلکہ اسے قاری کی سوچ اور احساسات کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔ان کی نظموں میں ایک نیا شعور اور احساس پیدا ہوا ہے، جو انسان کی شناخت، اس کی ذات، اور اس کی تقدیر کے حوالے سے سوالات اٹھاتا ہے۔ان کے اشعار میں سماجی اور ثقافتی مسائل کی گہرائی ہے، لیکن ساتھ ہی انسان کی داخلی دنیا کی پیچیدگیاں بھی نظر آتی ہیں۔یہ دونوں عناصر مل کر ان کی شاعری کو ایک مکمل اور جامع منظر نامہ فراہم کرتے ہیں، جس میں نہ صرف فرد کی ذہنی اور جذباتی حالت کا تذکرہ ہے بلکہ اس کے معاشرتی اور فلسفیانہ پہلوؤں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

ظفر امام نظموں میں سماجی، ثقافتی اور روحانی مسائل کی عکاسی کرنے کا انداز ان کو اردو ادب میں ایک منفرد مقام فراہم کرتا ہے۔ان کی نظموں کا اثر نہ صرف ان کے معاصرین پر پڑا بلکہ آنے والی نسلوں پر بھی ان کا گہرا اثر باقی رہا۔ان کی شاعری نے نہ صرف اردو ادب کو نیا شعور دیا بلکہ اس کے ذریعے انسان کی روحانی اور داخلی دنیا کی ایک نئے انداز میں تصویر کشی کی، جو آج بھی اردو ادب میں ایک اہم حوالہ ہے۔ظفر امام کی نظمیں اکثر مختصر اور سادہ ہوتی ہیں، لیکن ان کا اثر گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ان کی ایک مشہور نظم ''اقبال جرم'' ہے، جو نہ صرف اس کے الفاظ کی سادگی میں بلکہ اس کے پیغامات کی گہرائی میں بھی نمایاں ہے۔اس نظم میں ظفر امام نے انسان کے اندر کی اخلاقی کشمکش، ضمیر کی آواز اور اپنے کیے ہوئے اعمال کی جواب دہی کی بات کی ہے۔



CamScanner



''اقبال جرم'' میں شاعر نے اپنے کردار اور اعمال پر سوال اٹھایا ہے۔نظم میں استعمال ہونے والے الفاظ اور جملے نہایت مؤثر اور بامعنی ہیں، جو قاری کو اس کے اپنے ضمیر کی آواز سننے اور اپنی زندگی کے فیصلوں پر نظر ڈالنے کی ترغیب دیتے ہیں۔یہ نظم انسان کے اندر کی ان حقیقتوں کو اجاگر کرتی ہے جو وہ اپنے آپ سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے اور اس بات کا شعور دلاتی ہے کہ انسان کو اپنے کیے ہوئے اعمال کا حساب دینا پڑتا ہے۔

ظفر امام کا اس نظم میں جو مرکزی خیال ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی غلطیوں، کوتاہیوں اور گناہوں کا شعور رکھتا ہے، مگر وہ ان سے فرار اختیار کرتا ہے۔اس نظم کے ذریعے وہ اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ ہم اپنے اندر کی بیزاری اور احساس جرم سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن جب تک ہم اپنے اعمال کا اعتراف نہیں کرتے، اس وقت تک ہم خود کو سکون کی حالت میں نہیں پہنچا سکتے۔

اس نظم کی گہرائی اور اس کے اثرات اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسان کو اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے اور ان سے سیکھنا چاہیے۔ظفر امام نے اس نظم کے ذریعے ایک واضح پیغام دیا ہے کہ انسان کی ندامت اور توبہ کے عمل سے اس کی روح کی صفائی اور ترقی ممکن ہے۔نظم 'اقبال جرم' کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

میری آنکھیں جس منظر کو چھوتی ہیں
وہ چھو منتر ہو جاتا ہے، جس سے بھی باتیں کرتا ہوں
آوازوں میں خاموشی چھا جاتی ہے
جس سے بھی خواہش ہوتی ہے ملنے کی
جس کو بھی اپنے سانسوں میں رکھوں
دھوکا دیجاتا ہے

نظم ''اقبال جرم'' میں جو تخلیقی عنصر اور جمالیاتی قوت ہے، وہ اس کے ابتدائی الفاظ سے ہی واضح ہو جاتی ہے۔نظم کا آغاز ایک خاص منظر یا حالت کی عکاسی کرتا ہے جسے شاعر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور وہ منظر کوئی معمولی نہیں بلکہ ایک جادوئی تاثیر کا حامل ہے۔''چھو منتر ہو جاتا ہے'' جیسے الفاظ میں ایک عجیب و غریب تخلیقی قوت پوشیدہ ہے، جو اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ شاعر کے نزدیک ہر منظر اور واقعہ میں ایک جادوئی تاثیر ہو سکتی ہے۔یہ جملہ ایک ایسا لفظی اظہار پیش کرتا ہے جو شاعری کے روایتی قالب سے ہٹ کر نئی نوعیت کا تخلیقی منظر پیش کرتا ہے اور اس کی قوت تخیل کو ایک نیا زاویہ عطا کرتی ہے۔

یہ الفاظ صرف بصری سطح پر اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ ان میں ایک خاموشی، ایک چھپی ہوئی حقیقت

ISSN : 2582 - 3612

کی گونج بھی موجود ہوتی ہے۔ ''چھومنتر ہو جاتا ہے'' ایک مکمل ماحول، ایک داخلی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے جس میں شاعر کا ذہن اور اس کے جذبات فنی طور پر ایک پیچیدہ رشتہ قائم کرتے ہیں۔ یہ تخلیقی عنصر اس نظم کو سادہ بیان سے کہیں بڑھ کر ایک عمیق اور جادوئی اثر فراہم کرتا ہے، جو قاری کے ذہن میں دیرپا اثر چھوڑتا ہے۔

ظفر امام کی نظم میں تضاد (contrast) کی تکنیک بہت اہمیت رکھتی ہے۔ انہوں نے ''باتیں'' کرنے کی سرگرمی کے ساتھ ساتھ ''خاموشی'' کا ذکر کیا ہے، جو ایک نیا زاویہ فراہم کرتا ہے۔ یہاں ''باتوں'' کا عمل صرف زبانی سطح پر اثر انداز نہیں ہوتا، بلکہ اس میں خاموشی کی ایک گہرائی چھپی ہوتی ہے جو زبان کے ذریعے مکمل طور پر نہیں بیان کی جا سکتی۔ ''آوازوں میں خاموشی چھا جاتی ہے'' ایک ایسا مصرعہ ہے جو لفظوں کے بیچ میں چھپی ہوئی گہری حقیقت کو سامنے لاتا ہے، اور اس کے ذریعے شاعر نے انسانی جذبات، تعلقات اور اندرونی کیفیتوں کو نیا منظر پیش کیا ہے۔

اس نظم میں تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال اس کی شاعری کی جمالیات میں اضافہ کرتا ہے۔ ''چھومنتر ہو جاتا ہے'' ایک استعارہ ہے جو کسی بھی منظر کی جادوئی اور غیر متوقع تاثیر کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ نہ صرف منظر کی تشبیہ ہے بلکہ اس میں موجود اندرونی جذبہ، اثر، اور تبدیلی کو بھی بیان کرتا ہے۔ اسی طرح ''آوازوں میں خاموشی چھا جاتی ہے'' ایک تشبیہ ہے، جس میں خاموشی اور آواز کی حالتیں ایک دوسرے سے جڑ کر ایک نیا مفہوم پیدا کرتی ہیں۔ یہاں پر شاعر نے صرف الفاظ کا استعمال نہیں کیا، بلکہ ان الفاظ کے بیچ میں چھپے ہوئے جذبات اور اثرات کو بھی بیان کیا ہے۔

اس نظم میں نفسیاتی اور جذباتی جہت بہت واضح ہے۔ ''دھوکا دے جاتا ہے'' کا جملہ انفرادی تجربات اور تعلقات کے اندر کی پیچیدگیوں کو بیان کرتا ہے۔ یہاں شاعر نے انسانی نفسیات کو چیلنج کیا ہے، جو نہ صرف ذاتی سطح پر بلکہ سماجی سطح پر بھی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ جملہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جب ہم اپنے احساسات اور تعلقات کو کسی کے ساتھ بانٹتے ہیں تو ایک نہ ایک وقت پر ہمیں دھوکہ یا مایوسی کا سامنا ہوتا ہے۔

اس نظم میں جذبات کی شدت اور ان کی تبدیلی کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ شاعر نے بڑے خوبصورتی سے اس بات کو بیان کیا ہے کہ جب انسان کسی سے گہری وابستگی اور تعلق محسوس کرتا ہے، تو وہ خود کو دھوکہ دہی کے احساس میں مبتلا پاتا ہے۔

اس نظم کا مجموعی تاثر ایک گہرے کرب اور تنہائی کی شدت کو ظاہر کرتا ہے، جو قاری کو ایک جذباتی سفر پر لے جاتا ہے۔ ہر مصرعہ اور جملہ ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے، اور اس کی ترتیب اس طرح کی گئی ہے کہ قاری خود کو اس میں شامل محسوس کرتا ہے۔ یہ نظم انسان کے اندر کی پیچیدگیوں، ان کے جذبات اور خواہشات کی گہرائیوں کو بے نقاب کرتی ہے، اور ان تمام احساسات کا ایک پیچیدہ عکس پیش کرتی ہے جنہیں



CS CamScanner



ہم عموماً بیان نہیں کر پاتے۔

اس نظم کی فنی حیثیت اس کی معنوں کی گہرائی میں چھپی ہوئی ہے، جو نہ صرف الفاظ کی سطح پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ ان کے ذریعے شاعری کی ایک جذباتی شدت بھی ابھرتی ہے۔ شاعر نے اس میں تخلیقی اظہار کے ذریعے انسانی نفسیات کی پیچیدگیاں اور ان کے جذبات کی سچائیاں بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کی ہیں۔ ہر لفظ، ہر جملہ، اور ہر مصرعہ ایک نیا زاویہ سامنے لاتا ہے، اور قاری کو اس کی اندرونی دنیا میں لے جاتا ہے۔

ظفر امام کی ایک دوسری نظم ''یہ خوشی ہم کو حاصل ہوئی'' ہے۔ نظم اس طرح ہے ؎

یہ خوشی ہم کو حاصل ہوئی
جس کی برسوں سے دل میں تمنائیں تھی
جس کی خاطر بہت نیک نیت ہوئے
ساری چھوٹی بڑی آرزوؤں کی خوشیوں کو قربان کر
سیدھی سادی سی بے رنگ سی زندگی
میرے پلے پڑی
یہ خوشی ہم کو حاصل ہوئی تو مری ساری چھوٹی بڑی
آرزوؤں کی خوشیوں کی قربانیاں
میری قسمت نے رد کر دئے

یہ نظم ایک گہری اور پیچیدہ شعری تخلیق کی مثال پیش کرتی ہے، جو انسان کی خواہشات، قربانیوں، تقدیر اور خوشیوں کے تعلقات کو ایک نیا زاویہ دکھاتی ہے۔ شاعر نے اس نظم میں انسانی زندگی کی پیچیدگیوں کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے، جس میں خوشیوں کی خواہش، ان کی تکمیل اور پھر ان میں چھپے ہوئے نقصانات یا کمیابیاں واضح کی گئی ہیں۔

''یہ خوشی ہم کو حاصل ہوئی'' ایک ایسا مصرعہ ہے جو شروع میں ایک مثبت اور خوشی کی تصویر پیش کرتا ہے، جیسے انسان نے اپنی محنت یا کوشش کے نتیجے میں کامیابی حاصل کی ہو، لیکن اس کے بعد آنے والے الفاظ اور جملے اس خوشی کی اصل حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں۔ شاعر اس مصرعے کے ذریعے قاری کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہے کہ جو خوشی ہم چاہتے ہیں، وہ کبھی مکمل اور بے عیب نہیں ہوتی۔ یہ خوشی نہ صرف ظاہری سطح پر موجود ہوتی ہے، بلکہ اس کے اندر کی پیچیدگیاں اور تضادات اس کی حقیقت کو اور بھی زیادہ پیچیدہ بنا دیتے ہیں۔

شاعر نے خوشی کے حصول کے بعد اس کی پیچیدگیوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے

ISSN : 2582 - 3612

کہ اکثر وہ خوشیاں جو انسان توقع کرتا ہے، ان کے ساتھ کچھ کمی، غم یا تکلیف بھی جڑی ہوتی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جو خوشی انسان کو حاصل ہوتی ہے، وہ ہمیشہ مکمل طور پر تسلی بخش نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی نہ کوئی کمی ہوتی ہے، اور یہ کمی انسان کے اندر ایک نئے دکھ یا غم کو جنم دیتی ہے۔

اس نظم میں شاعر نے انسانی زندگی کی اس تضاد بھری حقیقت کو بہت خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے کہ انسان جو بھی حاصل کرتا ہے، اس میں کچھ نہ کچھ کمیاں چھپی ہوتی ہیں، جو اس کی خوشیوں کو ماند کر دیتی ہیں۔ اس کا مقصد یہ دکھانا نہیں کہ خوشیاں بے فائدہ ہوتی ہیں، بلکہ یہ ہے کہ انسانی زندگی میں ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، اور جو ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے، وہ کبھی مکمل یا عاری از تکلیف نہیں ہوتی۔

نظم کا آغاز ایک بہت گہری حقیقت کو سامنے لاتا ہے، اور اس کے ہر مصرعے میں ایک نیا زاویہ اور ایک نیا تجربہ چھپا ہوتا ہے۔ شاعر کی یہ تخلیق اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ خوشی کی حقیقت صرف ظاہری سطح پر نہیں ہوتی، بلکہ اس کی اندرونی گہرائیوں میں بھی کچھ نہ کچھ درد، کمی اور تضادات چھپے ہوتے ہیں جو انسان کی زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔

''جس کی برسوں سے دل میں تمنائیں تھیں'' سے شروع ہونے والا جملہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ خوشی کوئی معمولی یا اچانک ملنے والی خوشی نہیں ہے، بلکہ یہ وہ خوشی ہے جس کی انسان برسوں سے آرزو کر رہا تھا۔ یہ جملہ نہ صرف خوشی کے حصول کی آرزو کی شدت کو ظاہر کرتا ہے بلکہ اس میں انسانی فطرت کی وہ خواہش بھی شامل ہے جو وقت کے ساتھ اور بھی گہری ہوتی جاتی ہے۔

ظفر امام کی نظموں کا اسلوب ایک خاص سادگی اور گہرائی کا امتزاج پیش کرتا ہے، جس میں نہ صرف لفظوں کی خوبی ہے بلکہ ان کے ذریعے بیان کی جانے والی حقیقتوں کی شدت بھی جھلکتی ہے۔ ان کی نظموں میں جو سادگی پائی جاتی ہے، وہ خود میں ایک گہرائی رکھتی ہے جو قاری کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر ایک نیا زاویہ بھی کھولتی ہے۔ شاعر کے الفاظ میں ایسا تاثر ہوتا ہے کہ وہ سیدھے اور سادہ طریقے سے پیچیدہ حقیقتوں کو بیان کر جاتا ہے۔ ان کی شاعری کی سادگی میں ایک خاص نوعیت کی شدت اور اثر پذیری چھپی ہوتی ہے۔ ہر مصرعہ ایک سوال اٹھاتا ہے، ایک نئے تصور کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اور قاری کو اس کی گہرائیوں میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

ظفر امام کی نظموں میں طنز کا عنصر نہایت اہمیت رکھتا ہے، جو ان کی شاعری کو نہ صرف ادبی لحاظ سے دلچسپ بناتا ہے بلکہ سماجی اور سیاسی حالات پر ان کی نظر کی شدت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ جملے جیسے ''بھوک کا لاک ڈاؤن'' اور ''ضرورت کی گلی میں کھو گئی ہے'' نہ صرف موجودہ دور کی معاشی مشکلات اور سماجی ناانصافی کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ یہ میڈیا اور سیاست کے درمیان گٹھ جوڑ پر ایک سخت تنقید بھی ہیں۔ ظفر امام ان نظموں



CamScanner



میں اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ کس طرح سیاست اور میڈیا کے درمیان تعلقات عوام کے مسائل کو کم کرتے ہیں یا انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔ یہ جملے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اگر لوگوں کو بنیادی ضروریات جیسے خوراک اور صحت کی سہولتیں حاصل نہیں ہیں تو یہ حقیقت میڈیا اور سیاست کی بے حسی کو ظاہر کرتی ہے۔

ظفر امام کا یہ تنقید کا انداز محض نکتہ چینی نہیں ہے بلکہ یہ ایک گہرا پیغام بھی ہے جو سماجی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کی شاعری ہمیں اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ ہم اپنی موجودہ حقیقت کو اس طرح نظر انداز نہیں کر سکتے جس میں سماجی انصاف، سچائی، اور اخلاقی اقدار کا بحران ہو۔ ان کا مقصد صرف معیوب سیاسی یا سماجی حقیقتوں کو دکھانا نہیں ہے، بلکہ یہ شعور اجاگر کرنا ہے کہ ہمیں ان حقائق کا مقابلہ کرنا ہے اور ان پر سوال اٹھانا ہے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ جب میڈیا اور صحافت جھوٹ کے زیر اثر ہوں، تب ہم کس طرح کے سماج میں زندگی گزار رہے ہیں اور ہماری اقدار کس سمت جا رہی ہیں۔

ظفر امام کی شاعری نہ صرف ایک تنقید ہے بلکہ ایک آواز ہے جو ہمیں یہ سوال کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ آیا ہم سچائی اور انصاف کو بحال کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کر رہے ہیں یا نہیں۔ ان کے اشعار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہمیں سماجی اور سیاسی نظام پر سوال اٹھا کر اپنے اردگرد کی حقیقت کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان کی شاعری ایک تحریک کی طرح کام کرتی ہے، جو ہمیں شعوری بیداری کی طرف رہنمائی فراہم کرتی ہے اور ہمیں ایک فعال اور متحرک معاشرتی کردار ادا کرنے کی ضرورت کو سمجھاتی ہے۔

ظفر امام کی شاعری نہ صرف ادبی اعتبار سے گہری اور متوازن ہے بلکہ اس میں سماجی شعور اور حساسیت کی ایک منفرد جھلک بھی ملتی ہے۔ ان کی نظموں میں عصرِ حاضر کے مسائل پر گہری نظر ہے، جو ان کے اشعار میں واضح طور پر جھلکتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے وہ مسائل پیش کیے ہیں جو نہ صرف معاصر دنیا کے بلکہ انسانی زندگی کے بنیادی اور سنگین مسائل ہیں۔ ان کی نظموں میں سماجی، اخلاقی، اور سیاسی حقائق کا آئینہ پیش کیا گیا ہے، اور ان میں انسانی حقوق، مساوات، اور انصاف کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔

ظفر امام کی شاعری میں ان مسائل کو بیان کرنے کا طریقہ نہایت گہرا اور اثر انگیز ہے۔ وہ اپنے اشعار میں بھوک، بیروزگاری، افلاس، مزدوروں کی مشکلات اور سماجی ناانصافی جیسے موضوعات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری ان مسائل کو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ ان پر غور کرنے پر مجبور بھی ہوتا ہے۔ ان کی نظموں میں معاشرتی نابرابری اور طبقاتی فرق کی حقیقتوں کو بغیر کسی پردے کے بے نقاب کیا گیا ہے، اور ان کے اشعار میں ایک ایسا جذبہ پایا جاتا ہے جو عوام کے درد اور ان کے دکھ کو سمجھے بغیر سامنے نہیں آ سکتا۔

ISSN : 2582 - 3612

ظفر امام کی نظم نگاری ان کے فکری شعور اور سماجی ہمدردی کا غماز ہے۔ وہ ان مسائل پر محض سطحی نہیں بلکہ گہرا تجزیہ پیش کرتے ہیں اور ان کی شاعری میں انسانیت کی بحالی کا پیغام ہوتا ہے۔ ان کی شاعری اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ انسان کو نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنے معاشرے کے مسائل کو بھی سمجھنا اور ان کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ ان کی نظموں میں جہاں ایک طرف تنقید کی شدت ہے، وہیں دوسری طرف امید اور انسانی اقدار کی بحالی کا پیغام بھی ملتا ہے، جو قاری کو نہ صرف احساس دلاتا ہے بلکہ عمل کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔

**Isa Aslam**
Research Scholar
University Deptt. of Urdu
B. N. Mandal University
Madhepura (Bihar)
Mob.- 90606 89481

R.N.I. : BIH URD/2019/78036

CamScanner



نوراللہ نیاز مدنی

# ''سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ'' بحیثیت تاریخی سوانح عمری: ایک جائزہ

مولانا عبدالسلام ندویؒ نے بہت سی کتابیں مختلف موضوعات پر تصنیف کی ہیں، ان میں اہم اور مشہور کتابیں سیرت عمر بن عبد العزیزؒ، اسوہء صحابہؓ (دو جلدیں)، اسوہء صحابیاتؓ، امام رازیؒ، ابنِ خلدون، حکمائے اسلام (دو جلدیں)، انقلاب الامم، اقبالِ کامل، تاریخِ اخلاق اسلامی، شعر الہند (دو جلدیں)، تاریخ فقہ اسلامی، القضانی الاسلام، ابنِ یمین وغیرہ ہیں، ان میں سے تاریخی سوانح عمریوں کے دائرے میں جو کتابیں شمار کی جاسکتی ہیں ان میں اہم کتابیں ''سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ، اسوہء صحابہ (دو جلدیں)، اسوہء صحابیات وغیرہ ہیں، میں اپنے اس مقالہ میں صرف ''سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ'' کا تاریخی سوانح عمری کی روشنی میں جائزہ پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

''سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ'' مولانا عبدالسلام ندویؒ کی سب سے اہم تایخی سوانح عمری ہے، یہ پہلی بار 1919 میں شائع ہوئی تھی، جس ایڈیشن سے میں نے استفادہ کیا ہے، اس کی اشاعت 2018 میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے ہوئی ہے، اس میں تمہید کے بعد جلی عناوین کچھ اس طرح سے ہیں: دیباچہ، ازواج واولاد، اخلاق وعادات، اعمال وعبادات، کارنامہ ہائے زندگی، سیاست وحکومت، مآثر بنی امیہ وغیرہ۔

بہرحال اس کتاب میں انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے سوانحی حالات اور ان کے دورِ حکومت کے کارناموں کو بیان کیا ہے۔ آخری خلیفہء راشد سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجھہ کی شہادت کے بعد ان کے جانشین سیدنا حضرت حسنؓ کے امیرِ معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہونے کے بعد خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی، امیر معاویہؓ نے اپنی وفات سے پہلے ہی اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین بنادیا اور یہ اعلان کرادیا کہ سبھی لوگ یزید کو ان کے بعد اپنا خلیفہ مانے، اور تمام عرب سے ان کے ہاتھ پر بیعت کرائی۔ اگر غور کیا جائے تو اموی حکومت کے بانی حضرت معاویہؓ ہی ہیں، اگر چہ اموی دورِ حکومت میں سلطنت کو بہت زیادہ وسعت حاصل ہوئی، اور سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ دینِ اسلام کو بھی دور دراز ملکوں میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ خلافت راشدہ کے دور میں اسلامی سلطنت شام، مصر اور ایران تک محدود تھی، لیکن اموی دورِ حکومت میں اس کو اس قدر وسعت حاصل ہوئی کہ طرابلس، طنجہ، اندلس، تیونس، مراکش،

ISSN : 2582 - 3612

سندھ، قسطنطنیہ، عراق، خراسان، فارس، توران، افغانستان وغیرہ تک پھیل گئی۔ اموی حکومت کی ان تمام فتوحات کے باوجود صحیح اسلامی نظامِ حکومت جو خلفائے راشدین کے عہد تک قائم تھا، شہنشاہیت میں تبدیل ہو کر ختم ہو گیا، اس دنیاوی بادشاہت میں وہ تمام خرابیاں اور کمیاں در آئیں جو کسی بھی دوسری دنیاوی حکومت میں عموماً نظر آتی ہیں، اموی حکمرانوں کی عیش پرستی، رعایا کے لازمی حقوق کی پامالی، کمزوروں پر بے جا ظلم و ستم، ان کے املاک پر غاصبانہ قبضہ، عمومی ظلم و ستم، ناحق خون خرابے، رشوت خوریاں اور ناانصافیاں اپنے عروج پر پہنچ گئی تھیں، ان اسباب کی وجہ سے عوام میں غربت و افلاس، تنگ دستی، بے چینی و ناامیدی پھیل گئی تھی، لیکن جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے سلطنت کی باگ ڈور اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھاما، تو نہایت جرأت و پامردی کے ساتھ ہر طرح کے خطرات برداشت کر کے اس حکومت کو خلافت راشدہ کے قالب میں بدل دیا۔ مولانا عبدالسلام ندویؒ اس کتاب کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ:

''اسلام کی تاریخ تمام دنیا کی تاریخوں سے مختلف ہے، اسلام کا روشن ترین زمانہ صرف وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے شروع ہوا اور خلافت راشدہ تک پہنچ کر ختم ہو گیا، اس لیے خلفائے اسلام کا قابلِ فخر کارنامہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے دنیا کو اس نقط ؟ نورانی سے آگے بڑھایا، بلکہ ان کا حقیقی شرف یہ ہے کہ انہوں نے زمانہ کو اس قدر پیچھے ہٹایا کہ وہ عہد صحابہ سے جا کر مل گیا۔۔۔ لیکن ان میں صرف حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ایک ایسے شخص ہیں جنہوں نے زمانہ کی باگ پھیر کر اس کو عہدِ صحابہ سے ملا دیا، اس لیے محدثین نے ان کو مجددانِ اسلام میں شمار کیا ہے۔''

(سیرت عمر بن عبدالعزیز، از: مولانا عبدالسلام ندوی، تمہید، ص:2، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی، 2018)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مسندِ خلافت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے جو خطبہ دیا، اس میں آپ نے سارے لوگوں کے سامنے یہ بات کہی کہ مجھے عام مسلمانوں کے مشورے کے بغیر ہی خلیفہ نامزد کر دیا گیا تھا، اس لیے میں تمام مسلمانوں کو اختیار دیتا ہوں کہ وہ میری بیعت سے آزاد ہو سکتے ہیں، لیکن تمام مسلمانوں نے بہ آواز بلند کہا کہ ہم نے آپ کو اپنا خلیفہ مان لیا اور ہم آپ کی خلافت سے راضی ہیں، اس کے بعد آپ نے جو اہم بات کہی وہ قابلِ غور ہے، آپ اپنے اس خطبے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ:

''لوگو! جو شخص خدا کی اطاعت کرے، اس کی اطاعت واجب ہے، اور جو شخص اس کی نافرمانی کرے اس کی فرماں برداری جائز نہیں، جب تک میں خدا کی

R.N.I. : BIH URD/2019/78036
CS CamScanner



اطاعت کروں میری اطاعت کرو، اور اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو میری فرماں برداری تم پر فرض نہیں ہے۔''

(ایضاً، ص۔20)

چنانچہ خلافت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے عام لوگوں کو ان سے ظالمانہ و جابرانہ طور پر چھینی گئی جائدادیں واپس دلانا شروع کر دیں، اس سلسلہ میں انہیں خاندانِ بنوامیہ والوں کی ناراضگی بھی برداشت کرنی پڑیں، لیکن وہ راہِ حق سے ذرہ برابر بھی پیچھے نہیں ہٹے اور اپنے فرائض کو مکمل دیانت داری سے انجام دیا۔ اموالِ مغصوبہ کی واپسی کے بعد آپ نے یہ بھی کیا کہ جن جن علاقوں میں ظالم و جابر اور بد دیانت عمال مقرر تھے، ان تمام کو برخاست کر کے ان کی جگہوں پر ایماندار اور نیک صالح اشخاص کو متعین کیا، اس سلسلہ میں بھی آپ کے سامنے مختلف رکاوٹیں اور پریشانیاں آئیں، لیکن آپ نے اپنی حکمت و دانائی، تدبر اور رواداریوں سے سب پر قابو پا لیا۔ ان اصلاحی کاموں کے ساتھ ساتھ آپ کا اہم کارنامہ تدوینِ احادیث اور اشاعت اسلام بھی ہے، احادیثِ رسول ﷺ جو اس وقت تک صحابہ ءکرامؓ اور تابعینؒ کے سینوں میں محفوظ تھیں، آپ کو یہ خدشہ ہوا کہ احادیث کے تحریری شکل میں محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے مستقبل میں ضائع نہ ہو جائیں، اس لیے آپ نے مدینہ منورہ کے گورنر کو حکم جاری کیا کہ وہ احادیث نبویہ کی حفاظت کا سامان کریں، انہوں نے حاکمِ مدینہ کو جو حکم دیا وہ یہ ہے کہ:

''احادیثِ نبویہ کی تلاش کر کے ان کو لکھ لو کیوں کہ مجھے علم کے مٹنے اور علما کے فنا ہو جانے کا خوف معلوم ہوتا ہے اور صرف رسول اللہ ﷺ کی حدیث قبول کی جائے۔''

(ایضاً، ص۔124)

اسی طرح انہوں نے اصلاحی اور فلاحی کاموں کی طرف بھی توجہ کی، انہوں نے مذہبِ اسلام میں جو خرابیاں اور بدعات و خرافات در آئے تھے، ان کی اصلاح کی، اسی طرح بیت المال، محاصلِ زکات وصدقات اور جیل خانے وغیرہ کی اصلاح کی، اشاعتِ اسلام، احیائے شریعت، انسدادِ شراب نوشی، رفاہِ عام، غربا کی امداد و اعانت، زمین کی پیمائش، زرعی نہروں کی تعمیر، ڈاک کے انتظامات وغیرہ شعبوں کو بہتر بنایا اور ان کی خرابیوں و خامیوں کو دور کیا۔ آپ کی ان اصلاحی کاموں کی وجہ سے رعایا خوش حال و پرسکون زندگی گزارنے لگی، لوگوں کے سامنے ایک بار پھر خلفائے راشدین کا دور لوٹ آیا، آپ کی انہی اصلاحی اور تجدید کارناموں کی وجہ سے جب آپ کا انتقال ہوا تو ہر شخص چاہے وہ کسی بھی مذہب یا گروہ کا ہو وہ رنجیدہ و ملول تھا، تمام خلق غم میں ڈوبی ہوئی تھی، مولانا عبدالسلام ندویؒ نے اس موقع پر کئی واقعات نقل کیے ہیں۔

ISSN : 2582 - 3612

حقیقت یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد اگر کوئی خلیفہ کہلانے کا مستحق ہے تو وہ بلاشبہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہی کی ذات ہے، آپ نے جس طرح شاہانہ زندگی کو ترک کر کے ایک سادہ اور عام زندگی کو اپنایا، اسی طرح بیت المال جو کہ آپ سے پہلے بنو امیہ کے خلفاء کی ذاتی ملکیت ہوگئی تھی، وہ اسے جس طرح چاہتے استعمال کرتے تھے، اس کی نہ صرف اصلاح کی بلکہ بیت المال کا دروازہ تمام ضرورت مندوں کے لیے کھول دیا اور اس کے خزانے میں بے شمار اضافہ بھی کیا۔ آپ کی زندگی نہ صرف تمام مسلم فرمارواؤں کے لیے، بلکہ تمام مذاہب کے بادشاہوں کے لیے بے مثال نمونہ ہے۔

بہر حال مولانا کی یہ کتاب تاریخی سوانح نگاری کی روشنی میں اہم تصنیف شمار کی جا سکتی ہے، یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ مولانا کی تاریخی سوانح عمریوں میں مورخانہ حیثیت سے کچھ کمی نظر آتی ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ جب بھی کسی بھی موضوع پر ایک بار لکھنا شروع کرتے تو پھر لکھتے ہی چلے جاتے تھے اور اپنے لکھے ہوئے مسودے پر نظرِ ثانی بہت کم ہی کرتے تھے۔ یہ بات ایک مورخ کے لیے اچھی نہیں کہی جا سکتی لیکن پھر بھی ان کی اس تاریخی سوانح عمری میں ادبیت کے ساتھ ساتھ جامعیت اور اختصار بھی پائی جاتی ہے، ان کی اس کتاب میں دلکشی، رعنائی اور انشا پردازی بھی جگہ جگہ موجود ہے۔ مناسب بات یہ ہے کہ مولانا ادبیت کو قائم رکھتے ہوئے زیادہ تحقیقات کے لیے زیادہ تحقیقات میں الجھنا پسند نہیں کرتے ہیں، لیکن ان ساری باتوں کے باوجود بھی اس کتاب میں وہ کوئی بھی غیر محققانہ بات نقل نہیں کرتے ہیں، ساتھ ہی وہ نہایت اختصار و جامعیت اور تمام تر ادبی دلکشی و رعنائیوں کے ساتھ اپنی تحریر کو اپنے قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔

**Noorullah Niyaj Madani**
Research Scholar
Department of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad (Telangana)
Mob.- 62016 31457



CamScanner